"ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر"

ناول

اصغر ندیم سیّد

"ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر"

ناول

اصغر ندیم سیّد

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Asghar Nadeem Syyed
Toti Hoi Tanaab Udher / Asghar
Nadeem Syyed.-Lahore : Sang-e-Meel
Publications, 2019.
216pp.
1. Urdu Literature - Novel.
I. Title.
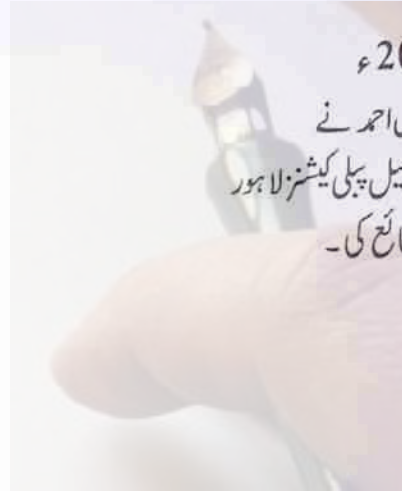
2019ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-3225-2
ISBN-13: 978-969-35-3225-8

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sangemeel.com e-mail: smp@sangemeel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

انتساب

شیبا

عدیل
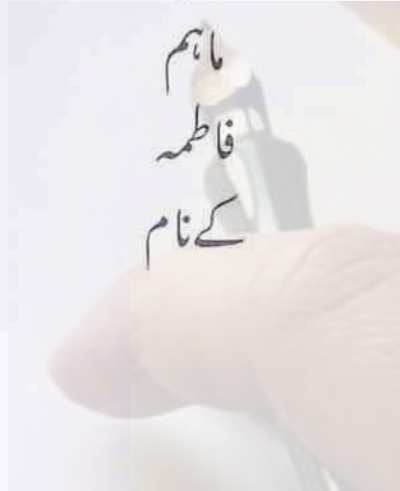
ماہم

فاطمہ

کے نام

فہرست

باب اول

بہت عجیب آدمی تھا وہ۔ اس کے دماغ میں دماغ نہیں تھا۔ تاریخ کا گھونسلہ تھا۔ وہ کوئی مورخ نہیں تھا۔ اس نے کسی کالج یا یونیورسٹی کا دروازہ نہیں دیکھا تھا لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ تاریخ میں ڈوبنے کے لیے اس قسم کا تردد کیا جائے۔ تو پھر تاریخ اُس کے دماغ سے شریانوں میں گھس گئی۔ سوال یہ کہ کون سی تاریخ؟

وہ بہت ہی پرانے شہر میں پیدا ہوا تھا۔ پرانے شہر کیا ہو سکتے ہیں؟

جیسے دمشق، بغداد، روم، تاشقند۔ شاید ان سب سے بھی پرانا ہو۔ پرانا شہر نئے شہر میں گم ہو جاتا ہے۔ نہیں نہیں نیا شہر پرانے شہر میں دکھائی نہیں دیتا یا اپنا الگ سے اظہار نہیں کر پاتا اور سکّہ پرانے ہی شہر کا چلتا رہتا ہے۔ ایسا ہی ایک شہر تھا جہاں منشی امام بخش ایک پتلی گلی سے جڑی ہوئی دس گلیوں کے درمیان ایک چوبارے کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ کمرہ کتابوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ وہ کتابوں ہی پر سکڑ کے سوتا تھا۔ شہر کے پڑھے لکھے جو شہر کی آبادی کے حساب سے اسّی فیصد تو ہوں گے کہ پرانا شہر پڑھے لکھوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ وجہ تو ایک ہی ہو سکتی ہے کہ پرانے شہر کی جڑوں میں صدیوں نے بسیرا کیا ہوا ہوتا ہے اور صدیاں اپنا معنی چھپا کے نہیں رکھتیں۔ وہ معنی تو منتقل ہوتا ہے۔ بہر حال شہر کے پڑھے لکھوں نے منشی امام بخش کو علامہ منشی امام بخش کا نام دیا تھا۔ منشی نے اُس کے علامہ ہونے کو

گھنایا نہیں تھا۔ اس لیے کہ منشی پرانے شہروں میں محض کھاتے کھتونیاں لکھنے کے لیے نہیں ہوتا تھا۔ منشی کا رتبہ اس سے کچھ بڑھ کے تھا کہ وہ انتظامی امور میں بھی خود کو ظاہر کرتا تھا اور اُس کو اس لیے مُنشی منقّی بھی کہا جاتا تھا اور وہ جاگیرداروں کی ناک کا بال سمجھا جاتا تھا لیکن علامہ منشی امام بخش بس لکھنے کی وجہ سے منشی تھا ورنہ تو وہ بس تاریخ کے اندر سانس لیتا تھا یا تاریخ اُس کے اندر زندہ تھی۔ منشی علامہ نہ بھی بنتا تو امام بخش تو وہ تھا ہی۔ اُس کا تاریخی شہر کمال کا تھا۔ صدیوں کو صدیوں میں ملائیں تو تب یہ شہر اُجاگر ہوتا تھا۔

ایک اونچے ٹیلے پر قلعہ بنایا گیا تھا۔ کسی وقت شہر کو افغانیوں کی یلغاروں سے بچانے کے لیے اور آس پاس کے راجوں اور نوابوں کی مقامی سطح پر بدمعاشیوں کو قابو میں لانے کے لیے۔ اس قلعے کے بیچوں بیچ شہر تھا۔ اُس میں باؤلیاں تھیں، کٹڑیاں تھیں، گلی در گلی محلّہ جات تھے۔ ہر محلے میں مکانوں کی قطاریں تھیں۔ ہر مکان نیچے سے اوپر تک جاتا تھا۔ یہ لگتا ہے کہ ٹاؤن پلاننگ کی معراج ہوگا کہ زمین کے رقبے کو بچایا جائے اور آبادی کو نیچے سے اوپر منتقل کیا جائے۔ اس لیے لاتعداد جھروکے، چوبارے، چھتوں پر ممٹیاں اور ممٹیوں پر کبوتروں کی چھتریاں اور کبوتروں کے دل میں محبت اور فقیری۔ اس کے ساتھ ہی ملحقہ مکانوں کی چھتوں پر طرح طرح کی سرگرمیاں ہوتی تھیں جن میں پہلی سرگرمی مسّیں پھوٹتے وقت کا عشق اور پھر ادھیڑ عمری کا عشق نُما دھوکہ۔ دھوکہ معشوق کے لیے اور عشق نُما عاشق کی طرف سے ہوتا تھا۔ ان گلیوں کے مکانوں، چھولداریوں، جھروکوں، دالانوں، ڈیوڑھیوں، راہداریوں اور چبوتروں سے گزرتے منشی امام بخش نے جوانی میں قدم رکھتے ہوئے محسوس کیا کہ وہ تو تاریخ کو بسر کر رہا ہے اور تاریخ کے زمانوں میں ہر جگہ موجود ہے۔ ایسے شہروں میں جوان ہونے کا تجربہ بے حد دلچسپ ہوتا ہے۔ امام بخش خوبصورت تو نہیں تھا کہ اُس کے باپ نے کسی افغان پٹھانی سے شادی نہیں کی تھی نہ ہی کسی افغان پٹھان نے امام بخش کی ماں سے شادی کی تھی۔ بس اُسی زمین کے اندر سے مٹی کے ناک نقش لے کر پیدا

ہوا تھا لیکن پھر بھی ایسے شہر میں جوانی ہی سب سے زیادہ ٹھٹھرتا ہوا سکہ ہوتا ہے۔ ٹھٹھرنے سے پہلے کبھی کبھی ٹھنڈا بھی پڑ جاتا ہے۔ ایسا امام بخش کے ساتھ بھی ہوا۔ ایک تو گرمیوں کے دنوں میں اندر کی گرمی دماغ پر چڑھ دوڑتی ہے اور دوسرا شدید حبس میں چوبارے پر لیٹے ہوئے نیند کے تعاقب میں جسم بہت بے کل ہو کر بس چارپائی توڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور ایسے میں اگر دو تین گز کے فاصلے پر ساتھ کے چوبارے میں ایسا ہی کوئی جوان جسم خود سے آزاد ہونے کی جدوجہد کر رہا ہو تو اُس کی چارپائی کی چولیں تو ویسے بھی بولنے لگتی ہیں اور اُس شہر کے ہر گھر کی چارپائی کی چولیں اور ادوائین ڈھیلی ہی رہتی تھیں۔ امام بخش کا تہبند بھی ڈھیلا رہنے لگا۔ شہر کی سرکاری لائبریریوں میں دن بھر تاریخ کی دیمک چاٹتے چاٹتے اُس کے ہاتھ کچھ ایسے ناول لگ گئے جو سستے بازاری کاغذوں پر چھپے ہوئے تھے۔ نہ اُس پر کسی پبلشر کا نام پتہ نہ ہی لکھنے والے کا اتہ پتہ۔ البتہ نام اس لیے درج ہوتا کہ اگر پڑھنے والے کو اس کا نشہ لگ جائے تو وہ اس برانڈ نام پر بھروسہ کر کے اس کا دوسرا ناول اُچک لے۔ نام سب نقلی ہوتے تھے لیکن نقلی یا جعلی نام بھی تو برانڈ نام بن سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اصلی نام اور اصلی مارکہ ہی برانڈ نام ہو۔ اس طرح امام بخش نے وہ ناول پڑھنے شروع کر دیئے اور کچھ دیر کے لیے تاریخ کی بھول بھلیوں کو فراموش کر دیا۔ اب وہ سرکار کی بنائی ہوئی لائبریری کا کیڑا بن گیا۔ ان ناولوں کو پڑھتے ہوئے وہ اکثر خود ہی خود میں سمٹ جاتا تھا اور سمٹا سمٹایا نکل جاتا تھا۔ رات کو چوبارے کی چھت پر اُس کے اندر سے جسم کی پکار بلبلا کر اُٹھتی جسے وہ دبا لیتا کہ شہر کا اپنا دستور تھا۔ وہاں ایک کوٹھے کی چھت سے دوسرے کوٹھے کی چھت پر لیٹی کسی بھی جوان لڑکی کی کروٹوں کو گننا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ بات صرف کوٹھا پھلانگنے کی تھی اور پھر نہ کسی نے بولنا تھا نہ کوئی بول سکتا تھا کہ جسم کی اپنی آمریت اور مطلق العنانی بھی تاریخ ہی کا ایک حصہ ہے۔

یہ سب کچھ امام بخش پر بیت رہا تھا۔ وہ بے چارہ تاریخ کے جھروکوں سے نکل کر

کہیں نفسیات اور حیاتیات کی بھول بھلیوں کا مسافر ہو چکا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہ آیا کہ باہر کی دنیا سے خود کو کس طرح وابستہ کرے۔ باہر بساطی کی دکان، قصائی، دھوبی، سبزی فروش، نائی، نانبائی، تندورچی، مٹھائی بنانے والا، خوانچوں پر دال مونگ، چنے اور دہی بھلے بیچنے والے کے ساتھ ساتھ حکیموں کی سلسلہ وار دکانیں اُن سے جڑی ہوئی پنساری اور کمہاروں کی دکانیں ...... سب کچھ وہی تھا جو امام بخش کی زندگی کا حصہ تھا لیکن وہ ان سب سے الگ ہو چکا تھا۔ ایسے میں اُس نے اپنے ہی محلے کے ایک نوجوان کا ہاتھ پکڑا ......

مقبول چغتائی محلے میں ایک انوکھی شہرت رکھتا تھا۔ چغتائی اس لیے تھا کہ اس کے آباؤ اجداد سینٹرل ایشیا سے آئے تھے یا نہیں آئے تھے، البتہ انہوں نے یہ نام حاصل کر لیا تھا۔ مقبول چغتائی عجب کردار تھا، وہ محلے کے تمام نوخیز نوجوانوں کا ہیرو تھا۔ اُس کا طریقہ واردات بہت واضح تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ خوش شکل تھا اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے لباس سے کچھ رول ماڈل بننے کی کوشش کرتا تھا۔ مقبول چغتائی کا طریقہ واردات یہ تھا کہ وہ گلی کے موڑ پر ایک ٹانگ اٹھا کر دیوار سے لگاتا تھا اور اپنا ایک ہاتھ گردن پر رکھ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ بے چارے مفلس پیشہ لڑکے اُس کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور وہ اپنی فتوحات کی تفصیل بتاتا تھا۔

مقبول چغتائی قصہ بن جاتا تھا اور اس کا قصہ اس طرح شروع ہوتا تھا کہ وہ جو کالے برقعے میں سکول جاتی ہے، اندر سے بے حد خوبصورت ہے اور جس کی آنکھیں افغانی برقعے سے باہر اُبلی پڑتی ہیں وہ تو مرمریں بدن ہے اور اُس نے دونوں کو خلوت میں اس طرح چکھا ہے اور سانسوں میں گُم کیا ہے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ مقبول چغتائی آہستہ آہستہ اپنے محلے کی لڑکیوں کے کپڑے اتارتا تھا اور پھر کپڑے پہناتا نہیں تھا۔ ایسے ہی اپنے کپڑے پہن کر باہر آ جاتا تھا۔ امام بخش اُس کے متاثرین میں شامل ہو گیا تھا۔ مقبول چغتائی نے اپنے محلے کے ہر گھر کی جوان لڑکی کو سب کے سامنے بے لباس کر دیا تھا۔ اب امام بخش کے لیے کام آسان ہو گیا۔ وہ صبح نکلتا اور برقعے میں لپٹی ہر لڑکی کو عریاں کر سکتا

تھا اور اُس کے جسم کے حوالے سے کوئی بھی زاویہ بنا سکتا تھا۔اس طرح جب امام بخش گلیوں میں نکلتا اور سامنے آئی ہوئی کوئی بھی عورت غلاف میں یا برقعے میں ہوتی تو وہ اپنی پسند کی تصویر بنا لیتا تھا۔اس طرح وہ ہر برقعہ پوش کو اپنے انداز سے خیال کا روپ دے دیتا۔اس طرح اُس شہر کی ہر عورت اُس کے خیال میں عریاں ہوگئی۔

رہی سہی کسر شہر کے حکیموں نے پوری کر دی تھی۔ پورے شہر کے مردوں کو اپنے خفیہ اور خاندانی سینہ بہ سینہ صدری نسخوں سے سرکاری سانڈ بنانے کی تگ و دو میں رہتے تھے۔شہر بھر کے مرد درجہ بہ درجہ ان کی فیاضانہ پیشکشوں سے فیض یاب ہوتے ہوئے خضاب پر ہاتھ صاف کرتے اور پہروں اپنی مردانگی کی آزمائش کے بہانے تلاش کرتے رہتے تھے۔خاص طور پر حجاموں کی دکانیں اور گرم حمام اُن کی فتوحات کے قصوں کے لیے ہائیڈ پارک کا درجہ رکھتے تھے۔یہاں انواع واقسام کے مردوں کا بازار لگتا تھا اور پھر جی بھر کے وہ ایک دوسرے کی حسرتوں کا تماشہ کرتے تھے۔یہیں کسی وقت میں امام بخش بھی آن دھمکا اور تو اسے اگرچہ شعور نہیں تھا کہ یورپ کی Nude Beaches کیسی ہوتی ہیں لیکن ایسا لگا کہ وہ ایسی جگہ آ گیا ہے جہاں سب کے تہبند تہہ کر کے ایک طرف رکھ دیئے گئے ہیں۔امام بخش نے خضابی مونچھوں کے نیچے زیرلب مسکراتے اُن فاتحین کو دیکھا تو کمر کی ہڈی میں سانپ سرسرا گیا۔امام بخش کو اب کسی جہاں دیدہ اور موسم چشیدہ صاحبِ اسرار و رموزِ نہاں خانۂ جذبِ دروں کی خدمات چاہیے تھیں جو ایک یا دو روپے میں اُس کے بلکتے جثّے کو ٹھنڈا کر سکے اور عزت کی نقدی بھی بچانے میں معاون ثابت ہو۔جلد ہی اُسے مقبول چغتائی کے توسط سے بلّا بانولی والا مل گیا۔اس کی آنکھیں بلی تھیں اور وہ شہر کے سبھی ایسے اڈوں سے واقف تھا جہاں کم پیسوں میں نوآموز شرمیلے نوجوانوں کی عزت کی ضمانت ہوتی تھی۔ یوں تو شہر میں درجہ بدرجہ کئی چکلے تھے جو چالو حالت میں تھے۔ چالو اس لیے کہ دوسرے شہروں سے آنے والے مسافر راہ چلتوں کو روک کر پوچھ لیا کرتے تھے۔

''بھائی صاحب چکلہ کس طرح کو ہے؟''

اور راہ چلتے معززین پوری ایمانداری سے مسافروں کو سیدھا راستہ دکھا دیتے تھے

''یہ جو اگلا چوک آئے گا وہاں سے دائیں مڑ جائیں تو آگے دو بازار اس میں شامل ہوتے ہیں۔ایک بازار سیدھا چکلے کو جاتا ہے۔وہاں کسی سے پوچھ لینا۔''

یہ معلومات ایسے دی جاتی تھیں جیسے کسی نے ضلع کچہری کا راستہ پوچھ لیا ہو۔یوں تو حکیموں نے شہر بھر کے سکولوں کے بچوں کو شہر کے شکاریوں کے ہاتھوں یرغمال بنا دیا تھا۔ہر سکول کے آس پاس ایسے عناصر منڈلاتے رہتے تھے اور اپنا نشانہ جلد یا بدیر کسی معصوم کو بنا لیتے تھے۔شہر میں یہ رواج عام بھی تھا اور اسے بھی فخریہ انداز سے اپنی فتوحات کے زمرے میں شامل کیا جاتا تھا۔اسی دوران ایک کردار کی شہرت عروج پر پہنچ گئی۔اس کا نام تو حاجی حیات اللہ تھا لیکن اس نے شہرت ''حاجی ایک منٹ'' کے نام سے پائی۔یہ نام ایسے پڑا کہ وہ جب بھی کسی لڑکے کو یہ کہہ کر پکارتا تھا ''ذرا ایک منٹ'' اگر تو لڑکا رُک گیا تو سمجھ لیں شکار ہو گیا نہ رُکا تو بچ گیا۔اس طرح ''حاجی ایک منٹ'' پورے شہر میں اپنے ہنر کے باعث کوٹھوں چڑھا اور جب علماء کرام مجالس میں قومِ لُوط کا قصہ بار بار سُنایا کرتے مگر قصہ سمجھ کر......

امام بخش کا رجحان ''حاجی ایک منٹ'' سے کسی بھی طرح نہیں ملتا تھا۔اُس نے بلّا بانولی والا کی مدد سے ایک مفلوک الحال آبادی کے ایک کچے گھر پر دستک دی۔

''کون؟''

''وہ یہاں شانو رہتی ہے؟''

''ہاں......کون ہو تم؟''

''میں بلّا بانولی والا......وہ ایک لڑکا ہے۔''

''پیسے بتا دیئے۔''

''ہاں دو روپے اس سے لے لینا۔''

''پہلی دفعہ والا دفادور ہے یا......''

''پہلی دفعہ آیا ہے۔ ذرا گھبرا رہا ہے۔ خیال رکھنا۔''

''ہاں بیٹا بنا کے گود لے لوں گی۔ بھیج دے۔ سب ہی ایسے لاتے ہو جو مجھے گندا کر کے چلے جاتے ہیں۔ ویسے بھی نلکے میں پانی زور لگانے سے آتا ہے۔''

''ہاں بس اب دیکھ لینا......''

اسی طرح امام بخش کا وہ حال تھا کہ خیالوں میں مقبول چغتائی کی باتیں۔ ناولوں میں تفصیلی منظرنامے اور گرم حماموں کے خضاب آلود جعلی فتوحات کے قصے ایک جھلک میں مونتاج بن کر گزر گئے۔ وہ اندر گیا۔ وہاں شانو کے تین مختلف عمروں کے بچے مٹی سے لتھڑے صحن میں کلبلا رہے تھے۔ ایک مٹی کھا رہا تھا۔ ایک ماں سے لپٹا تھا۔ ایک کپڑے کے جھلنگے میں پڑا تھا۔ شانو نلکے پر کپڑے دھو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا جس سے وہ کپڑوں کو مار مار کے میل نکال رہی تھی۔ اُس نے دھوتی باندھ رکھی تھی کہ وہاں یہ آسان اور ستا لباس شمار ہوتا تھا۔ اس کا پورا جسم اور کپڑے پانی سے تربتر تھے۔ اُس نے امام بخش کو دیکھا اور کہا ''اندر آ جاؤ۔'' امام بخش یہ سب کچھ سمجھ نہ پایا اور اب اُسے تو ویسے بھی خیالوں میں طرح طرح کے نقشے یاد تھے۔ یہ جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا، یہ تو اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا لیکن اب وہ پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے وہ کمرے میں اُس عورت کے پیچھے چلا گیا۔ اُس کے تینوں بچوں کا ماں کے جانے کے بعد اپنا اپنا ردِعمل تھا۔ جو بچہ ماں سے لپٹا تھا، وہ رونے لگا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ جو اجنبی آیا ہے وہ ماں کے ساتھ کیا کرنے والا ہے یا ماں کی عارضی جدائی نے اُسے پریشان کر دیا تھا۔ اسی طرح دوسرے بچے نے جو مٹی کھا رہا تھا، حیرت سے مٹی کھانا ترک کیا اور کمرے کی طرف دیکھنے لگا۔ جھلنگے میں لیٹا بچہ بھی کروٹ لے کر ماں کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

امام بخش نے پاجامہ اور قمیص پہنی ہوئی تھی۔ جونہی وہ کمرے میں داخل ہوا۔ شانو

نے پلک جھپکتے میں دھوتی اتار کے پھینکی اور اپنی قمیص جو گیلی تھی، اس طرح اُتاری کہ گیلے پن کی وجہ سے اتارنے میں جسم کے مختلف حصوں سے چولی کو اوپر جاتے ہوئے ایک طرح کا ایسا وقت لگا کہ جس میں امام بخش کو ایسا تجربہ ملا کہ اُس کے سارے طبق روشن ہو گئے۔ اب ایک محنت کش عورت کا ایسا جسم سامنے تھا جس کے پیٹ میں نان ونفقہ برائے نام آتا تھا۔ اس لیے پیٹ کمر سے لگا ہوا تھا۔ چھاتیاں اگرچہ جسم سے لگی ہوئی تھیں لیکن لمبے قد کی وجہ سے لمبی گردن ہونے کے ناتے اُن کی پینٹنگ اچھی بن سکتی تھی۔ امام بخش کے سامنے الف ننگی عورت لیٹ گئی۔ غریب ابھی مشکل سے پاجامہ ہی اُتار پایا تھا اور اپنے خیالوں کو مجتمع نہ کر پایا کہ باہر کھڑے ''بلا بانولی والا'' کے کانوں میں یہ آواز آئی

''آ جاتے ہیں چھڑ کاؤ کرنے۔ گنڈا لنے۔''

بلّا بانولی والا کے لیے یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ وہ سب سمجھ گیا کہ وہ تو عرصے سے اِسی خدمت پر مامور تھا۔ اب اُسے امام بخش کی شکل میں ایک اور تحفہ وصول کرنا تھا۔ سو امام بخش پاجامہ اُڑستا ہوا باہر دھکیل دیا گیا اور شانو کی آوازیں پیچھا کرتی رہیں اور وہ دونوں اُس مفلوک الحال آبادی سے باہر نکل رہے تھے۔ آوازیں ایک مونتاج بنا رہی تھیں۔

''ماں سے کیوں نہیں...... کب سے رُکے ہوتے ہیں...... ان کے پاس کوئی اور طریقہ...... کچے انڈے کی اولادیں...... وغیرہ وغیرہ''

امام بخش باہر آیا۔ بلّا بانولی والا خاموش تھا اور پھر یہ سارا سفر خاموشی میں گزرا۔

امام بخش جب اُس شہر کے چکلوں کی تاریخ دیکھ رہا تھا تو اُسے یہ واقعہ یاد آیا۔ امام بخش جو تاریخ میں رہ رہا تھا، اُسے اپنی تاریخ سے بھی گزرنا تھا اور وہ جب تاریخ سے گزرا تو شہر کے سارے خاندان اُس کے سامنے بے نقاب ہو گئے کہ وہ تو اُن سب کے شجرہ نسبوں سے واقف ہو گیا۔ یہ ایک عجیب انقلاب تھا جو امام بخش کی زندگی میں آیا اور وہ بھر گیا کہ جو

کچھ اُس کے ساتھ جوانی میں ہوا وہاں تو چکلوں کا بھی شجرہ نسب تھا۔ وہاں کسی کی بیوی باغی ہو کر بیٹھی۔ کسی کی بیٹی کو وہاں بٹھا دیا گیا اور خاندان خاموش ہو گیا۔ کیوں خاموش ہو گیا؟ کیا بیٹی کو سزا دینا مقصود تھا یا کچھ اور تھا۔ بہر حال امام بخش کا اولین تجربہ اُسے چکلوں کی تاریخ کی طرف لے گیا اور طرح طرح کے انکشاف اُسے ہوئے۔

منشی علامہ امام بخش عمر کے اب آخری پہر میں قدم رکھ چکا تھا اور شہر بھر کے آوارہ مزاج پڑی سے اترے ہوئے دانشوروں، سیاسی نظریہ بازوں، وکلاء جو وکالت سے زیادہ ادب میں منہ مارتے تھے، غیر حاضر دماغ پروفیسروں، سڑک چھاپ شاعروں اور رات کی آخری شفٹ کے صحافیوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ تھا جو سب کو حسب حال روزانہ شام کو قصے سنانے کے لیے گھر سے نکل پڑتا۔ شہر کے ایک سرے سے آخری سرے تک پھیلے ہوئے قہوہ خانوں، چائے خانوں، ریستورانوں اور پارکوں میں جمی ٹکڑیوں تک پھیرا لگا لیتا۔ آخری پھیرا اُس کا آخری شفٹ کے صحافیوں اور رپورٹروں کے چائے خانے کا ہوتا تھا۔ امام بخش چلتی پھرتی تاریخ اور تاریخ سے نکالے گئے قصوں کا سوداگر تھا۔ اپنی جوانی کے اولین تجربے نے اُسے آج چکلوں کی تاریخ پر روشنی ڈالنے کے لیے شہر کے قہوہ خانوں اور چائے خانوں میں بیٹھنے والے طرح طرح کے کرداروں کے لیے کچھ نئے انکشافات کے لیے اُکسایا اور منشی امام بخش نے پہلا پڑاؤ سیاسی نظریہ بازوں کے ایک کیفے فصیلِ شہر میں کیا:

"تمھیں پتہ ہے انسانی سماج میں پہلا چکلہ کب وجود میں آیا؟"

"کب وجود میں آیا؟" ایک ترقی پسندی سے مایوس بابے نے پوچھا۔

"جب پہلی بار ایک عورت نے اپنے سماج سے بغاوت کی۔"

"کیوں بغاوت کی؟"

"اس لیے بغاوت کی کہ وہ ایک سوشل کنٹریکٹ کے تحت ساری زندگی ایک مرد کی غلامی میں آنے کو تیار نہیں تھی جو ہر رات بغیر کسی ادائیگی کے اور اُس کی رغبت کا احترام

کیے اُس کا استحصال کرتا ہے۔''

''اُسے کس نے یہ اجازت دے دی۔ قتل کیوں نہ کر دیا۔''

''ہاں اچھا سوال ہے۔ وہ گھر سے بھاگ گئی اور پھر......''

''اور پھر......''

''اور پھر اُس نے پہلے تو اپنے عاشق کا پتہ لیا جو اُس کا پہلا عاشق تھا اور شادی سماج کے اصولوں پر ہوئی تھی۔ عاشق کے ساتھ جنگل میں کئی راتیں گزاریں۔ جنگل مہک اٹھا۔ اُس کے بدن کی خوشبو سے پرندوں نے چہچہانا سیکھا۔ پورا جنگل جاگ اٹھا۔ پھول خوشبو دینے لگے۔ کونپلوں نے مہک پھیلائی اور ایک عورت کا جسم کائنات کی آب و ہوا بن گیا۔''

''منشی جمع علامہ امام بخش سیدھی بات بتاؤ، تم تو شاعری کرنے لگے۔'' ایک نظریاتی سیاسی کیڑے نے کلبلا کر کہا۔

''سیدھی بات اگر جاننی ہے تو تمہیں داستانوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔''

''وہ کس لیے؟''

''اس لیے کہ داستانیں سارے بھید جانتی ہیں۔ ایسے ہی میں نے تاریخ کو چھا نہیں ڈالا۔'' منشی علامہ امام بخش بدک گیا تھا۔

''اچھا تو خود ہی بتاؤ کہ چکلے کیسے قائم ہوئے؟''

''اب ذرا غور سے سنو۔''

''اگر غور سے نہ سنیں تو کیا چکلہ نہیں بن پائے گا؟''

''نہیں یار آپ تو مذاق اڑا رہے ہو۔''

''ایسا نہیں ہے۔ آپ کھل کے بات کریں۔''

''کھل کے بات یوں ہے احمد نواز انقلابی کہ تیری بیوی تین بچے چھوڑ کے آخر

بھاگ گئی ناں اپنے عاشق کے ساتھ۔ مُڑ کے بھی نہیں دیکھا اُس نے۔ جگرا چاہیے تین بچے چھوڑنے کے لیے جگرا......''

''دیکھ امام بخش وہ ٹھیک بھاگی تھی۔ پوچھو کیوں؟''

''پوچھ لیا۔ بولو۔''

''وہ ناں میں نے اُس کی طرف کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ اگر مکان کو خالی چھوڑ دیا جائے تو اُس میں جن بھوت بسیرا کر لیتے ہیں۔ کوئی تو عورت کی تعریف کرنے والا ہونا چاہیے ناں۔ میں جب صبح اٹھتا تو وہ بچے بھگتا کر دوپہر کا کھانا بنا رہی ہوتی اور جب رات کو آتا تو وہ سو رہی ہوتی تھی، چھوٹے کو سینے سے لگائے۔''

''اور تجھے تب بھی پتہ نہ چلا کہ وہ بچے کو سینے سے لگا کر کیوں سوتی تھی؟''

''دیکھو امام بخش عرف علامہ مجھے اُس کے جانے کا کوئی ارمان نہیں۔ پوچھو کیوں؟''

''بتاؤ کیوں؟''

''وہ اس لیے کہ عورت کی میری زندگی میں کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''تمھیں پتہ ہے احمد نواز انقلابی کہ انقلاب اکیلے مرد نہیں لایا کرتے۔ عورتیں بھی اس کا حصہ ہوتی ہیں۔''

''وہ چلی گئی۔ پر ایک بات ہے۔ تھی وہ بہت ضدی۔ بچوں کو چھوڑ دیا تو مُڑ کے نہیں دیکھا۔''

''بس یہی بات احمد نواز انقلابی تجھے بتا رہا تھا کہ داستانوں میں عورتوں کے کردار، مردوں پر حاوی ہیں۔ یاد کرو اِندر سبھا کی سبز پری شہزادہ گلفام اُس کے سامنے ایک چُوچا لگتا ہے۔ کیسے اُٹھا کے لاتی ہے اور پھر یاد کرو اُس شہزادی کو جو ایک زنگی غلام کو پسند کر کے سارے قاعدے قانون ایک طرف رکھ دیتی ہے اور محل سے اُس کے حجرے تک

سرنگ بنواتی ہے۔ شام کو وہ اُس کے کمرے میں آتا ہے اور پھر فجر کی نماز تک دونوں ناؤ نوش اور بوس وکنار سے ہم کنار ہوتے ہیں۔''

''ہاں ہاں امام بخش آگے بتا۔ یہ جو چکلوں کی تاریخ ہے اُس میں عورت مرضی سے پیشہ کرتی ہے یا اُس سے پیشہ کرایا جاتا ہے۔'' ریاض گویرا نے پوچھا۔ ریاض گویرا کی بھی ایک کہانی ہے۔ کمیونسٹ ہونے کی وجہ سے وہ ریاض لکھویرا سے ریاض گویرا ہو گیا۔ چی گویرا کی روح کے ساتھ یہی سلوک ہونا تھا۔

امام بخش نے اُس کے سوال کو سنا اور اُس کے انقلابی ہونے پر تُف کیا کہ وہ جو ساری زندگی استحصالی نظام کی رَٹ لگائے ہوئے اپنے ہونے کا احساس رکھتا تھا، اتنی سی بات بھی نہیں جانتا کہ رنڈی یا عورت چکلے میں مرضی سے پیشہ کرتی ہے یا اُس سے کرایا جاتا ہے۔ اس پر امام بخش نے پہلے ایک واقعہ سنایا:

''یار تمہارے اس سوال کا جواب میں اپنے ایک واقعے سے دیتا ہوں جو میری زندگی کی یادوں سے بُری طرح چپک گیا ہے۔''

احمد نواز انقلابی اس سارے سسپنس کا متحمل نہیں ہو سکا اور بولا ''دیکھو امام بخش تم ایسے قصہ گو ہو جو بڑا لالچی ہوتا ہے۔ خوامخواہ قصہ روکتا ہے۔ سننے والا کا امتحان لیتا ہے اور دیکھ ہم اتنے الو کے پٹھے نہیں کہ ہمیں پتہ نہ چلے قصے میں کیا موڑ آئے گا۔ بات سُن۔ اب قصوں کے سارے اسرار ورموز کُھل چکے ہیں۔ ہم کو چوتیا نہ بنا......''

''دیکھو چوتیا انسان خود بنتا ہے، کوئی اُسے بناتا نہیں۔ بہر حال چکلوں اور پیشے کے حوالے سے جو واقعہ یاد آیا ہے، وہ بے حد اہم ہے۔''

ریاض گویرا نے دلچسپی لے کر کہا ''اچھا علامہ اگر واقعہ تیرے اندر آ گیا ہے تو اُسے اُگل دے۔''

''ہاں تو میں ایک دفعہ تر کی گیا تھا۔ بات مختصر کرتا ہوں کہ کیوں گیا تھا۔''

''ہمیں کئی دفعہ بتا چکے ہو۔ کیوں گئے تھے۔ چکلے کی بات کرو۔''

''ہاں تو اب پتہ چلا قصہ روکنے سے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ خیر سنو۔ میں انقرہ میں تھا۔ شام کو ایسے ہی میں نے اپنے دوست سے فرمائش کی کہ مجھے یہاں کا چکلہ دیکھنا ہے۔ وہ شک میں آ گیا کہ میرے اندر کوئی فتنہ جاگا ہے۔ میں نے کہا، ایسا نہیں۔ میں چکلوں کی تاریخ پر کام کر رہا ہوں۔ وہ مجھے لے گیا۔ چکلہ یوں سمجھو کہ لاہور کے ریلوے سٹیشن کے آس پاس کا کوئی علاقہ ہوگا۔ ایک پھاٹک لگا تھا جس کے دونوں اطراف دو چھوٹے دروازے کھلے تھے۔ ایک آنے کا ایک جانے کا۔ اس کا مطلب تھا چکلہ کُھلا ہے۔''

''اچھا تو پھر کیا ہوا؟''

''پھر میں سات بج کر پینتالیس منٹ پر داخل ہوا۔ بیچ کی راہداری کے دونوں طرف کیبن بنے ہوئے تھے۔ شیشہ لگا تھا جس میں عورت یا لڑکی بن سنور کے بیٹھی تھی۔ آپ شوکیس میں بیٹھی لڑکی پسند کریں تو ساتھ ہی اس کا ریٹ لکھا ہوا لٹک رہا تھا۔ آپ پورے بازار میں اپنی پسند کا سودا لے سکتے ہیں یعنی فری اکانومی۔ کنزیومر کے حقوق۔ خریدنے کی آزادی وغیرہ وغیرہ اور ہاں یہ ایسے ملک میں جو یورپ سے ملنا چاہتا تھا اور خود کو جدید معیشت اور ترقی کا دعویدار سمجھتا تھا۔''

''پھر قصہ روک دیا۔ بکواس کرو۔ آگے کیا ہوا؟''

''دیکھا قصہ روکنے کا مزا کیا ہوتا ہے؟ خیر میں نے وہاں ایک بورڈ پر نظر ڈالی۔ اس پر اردو میں ترجمہ کرو تو لکھا تھا۔ اوقاتِ کار۔ دوپہر دو بجے سے شام آٹھ بجے تک۔ اس کا مطلب یہ کہ وہ عورتیں ایک آفس ٹائم کے قواعد پر عمل کر رہی تھیں اور یہ حکومت ترکیہ نے قانون کے مطابق انہیں وہ جگہ فراہم کی ہوئی تھی۔''

''آگے بولو امام بخش عرف علامہ۔''

''تو اب سُن لو۔ میں نے دونوں طرف کے شوکیسوں میں جھانکا، کچھ شوکیس خالی تھے۔ مطلب وہ لڑکیاں اپنے کیبن میں گاہک بُھگتا رہی تھیں اور جو شوکیس لڑکیوں سے سجے ہوئے تھے، ان میں بقول شخصے دعوتِ گناہ دیتی ہوئی کئی طرح کے مختصر لباسوں میں مختلف عمروں کی لڑکیاں/عورتیں موجود تھیں۔ ایک تو باقاعدہ ٹائم پاس کرنے کے لیے سویٹر بُن رہی تھیں۔''

''ہوسکتا ہے یہ اس کا ٹریڈ سیکرٹ ہو۔ وہ اس طرح گھریلو مردوں کو لبھاتی ہوں اور ہاں یہ کیا ضروری ہے کہ ہر لڑکی یا لڑکی نما عورت دعوتِ گناہ ہی دے رہی ہو۔ وہ دعوتِ ہمدردی بھی تو دے سکتی ہے۔''

''دیکھ ریاض گویرا...... اب تم قصے کو روک رہے ہو۔ کبھی کبھی سننے والا بھی قصہ روکنا چاہتا ہے۔ یہ تجربہ تجھے اب سمجھ میں آیا ہے۔ بہر حال آگے بڑھتا ہوں۔ تو پھر میں نے دیکھا ہر کیبن پر محکمہ صحت کا سرٹیفکیٹ لگا ہوا تھا۔ آخر میں سرکاری مُہر ثبت تھی۔ یہ ترکی اور انگریزی دونوں زبانوں میں تھا۔''

''اس کا مطلب ہے یہ چکلہ غیر ملکیوں کے لیے بھی تھا۔''

''بات سے تم جو نتیجہ نکالو۔''

''اس پر کیا لکھا تھا۔''

''اس پر لڑکی کا نام۔ اُس کی عمر۔ اُس کی چھاتیوں اور کمر کا سائز اور......''

''اور کیا؟''

''اور کیا ہوسکتا ہے۔ بس یہ کہ اُسے کوئی بیماری وغیرہ مطلب چھوت چھات اور دیگر زنانہ و پوشیدہ قسم کی نہیں ہیں۔''

''تمھیں کوئی پسند آئی۔ علامہ امام بخش۔''

''ایک تو اُس وقت میں نے علامہ کا ٹائٹل حاصل نہیں کیا تھا۔ دوسرا میں ریسرچ

سٹڈی کر رہا تھا۔ بہر حال گھنٹی بجی زوردار طریقے سے جیسے سینما کا شو ٹوٹتا ہے یا فیکٹری کا سائرن بجتا ہے چھٹی کے الارم کا...... تو کچھ کیبنوں سے مرد کپڑے سنبھالتے ہوئے باہر نکلے۔ اپنے بال وغیرہ ٹھیک کرتے ہوئے اپنے راستے ہو لیے۔''

''بس اسی واردات کے لیے ہمارا اتنا ٹائم ضائع کیا۔''

''نہیں ابھی کہانی باقی ہے۔ جو لڑکیاں شوکیسوں میں فارغ بیٹھی تھیں یا سویٹر بُن رہی تھیں وہ آٹھ بجنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ جیسے کوئی نکما افسر یا کلرک آفس ٹائم ختم ہونے کے لیے جمائیاں لے رہا ہوتا ہے۔ ایسے ہی وہ لڑکیاں آٹھ بجتے ہی اپنے میک اپ بکس اٹھا کر کیبن کو تالہ لگا کے باہر کی طرف جلدی میں جانے لگیں۔ کوئی بس کے انتظار میں کھڑی ہو گئی۔ کوئی پیدل ہی نکل گئی۔ ان میں ایک لڑکی یا عورت جس کی عمر مشکل سے اٹھائیس تیس سال ہو گی، گیٹ سے نکل کر ایک چھوٹی سی گاڑی جو پہلے سے وہاں موجود تھی میں آ کر اگلے دروازے سے اگلی سیٹ پر ایک چار سال کی پیاری سی بچی کو گود میں لے کر بیٹھ گئی اور بچی کو پیار کرنے لگی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اُسی عمر کا ایک آدمی سمارٹ تھا، بیٹھا ہوا تھا۔ وہ گاڑی چلا کر لے گیا۔ مجھے ایسا لگا وہ عورت اپنے دفتر سے نکلی ہے اور اُس کا شوہر بچی کے ساتھ اُسے لینے آیا ہے اور اب وہ اپنے گھر چلے گئے ہیں۔ یہ حقیقت کھلتے ہی میرے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ میں اپنی جگہ پر گُم صُم ساکت ہو گیا......

اصل حقیقت یہی تھی جو میں دیکھ رہا تھا کہ وہ لڑکی گھر کے لیے یہاں کمانے کے لیے آئی تھی۔ جیسے یہ اُس کا دفتر ہو۔ اُس کا شوہر اُس کے اُس کام کو قبول کر رہا تھا۔ اب آگے میرا تخیل آپ کو لے جائے گا۔ میرا نہیں آپ سب کا خیال اس کو آگے بڑھا سکتا ہے۔ اُن کا چھوٹا سا فیملی ہو گا۔ ہو سکتا ہے ایک بچہ اور بھی ہو جو گھر پر رہ گیا ہو۔ ہو سکتا ہے ان کا کوئی کتا بھی ہو جو گھر میں داخل ہوتے ہی لڑکی سے لپٹ جاتا ہو۔ ہو سکتا ہے شوہر بھی دفتر میں کام کرتا ہو۔ دونوں کے اپنے اپنے اوقات کار ہوں۔ دو بجے تک بیوی گھر سنبھالتی ہو

اور پھر بیوی کام پر جاتی ہو اور شوہر گھر سنبھالتا ہو۔ ان کے رشتہ دار بھی ہوں گے۔ یہ لوگ ملتے بھی ہوں گے۔ بچی کو باپ کیا بتاتا ہوگا کہ تمہاری ماں کس کام پر گئی ہے اور گھر آتے ہوئے شوہر کیسے پوچھتا ہوگا کہ آج کتنی کمائی ہوئی۔ کمائی کم ہونے پر شوہر کیا سوچتا ہوگا کہ گھر کے بل کیسے ادا ہوں گے۔ گاہک آنے جو کم ہو گئے ہیں اور اگر اُس دن گاہک زیادہ آئے ہوں گے تو وہ بیوی کے متعلق کس طرح محسوس کرتا ہوگا۔ اُس کی مشقت پر خوش ہوتا ہوگا کہ اداس۔ یہ سب سوالات میں تمہارے سامنے رکھ رہا ہوں۔ اب تم فیصلہ کرو کہ عورت مجبوری میں دھندہ یا پیشہ کرتی ہے یا یہ اُس کا انتخاب ہوتا ہے؟'' منشی علامہ امام بخش یہ سب کہہ کر چُپ ہو گیا۔ اب محفل جو کہ سرِ شام ہی شروع ہو گئی۔ یوں لگا اس پر صدیاں گزر گئی ہیں اور کوئی موسم کئی زمانے اس کے اوپر سے ریشمی چادر کی طرح سرک گئے ہیں۔ آخر منشی علامہ امام بخش نے سکوت توڑا اور کہا کہ یہ جو شوہر اور بیوی نے آپس کی رضامندی سے اس پیشے کو قبول کیا ہوا تھا تو اُس کی نفسیاتی جہتیں بھی تو ہوں گی۔ خیر ہم اس میں نہیں جاتے مگر ایک بات تاریخ سے واضح ہے۔

''اب تم تاریخ سے سند لاؤ گے یا کوئی قصہ سناؤ گے؟''

''ہاں قصہ سناؤں گا۔ تمہیں پتہ ہے اس شہر کے مرکزی چکلے میں ہر نامور خاندان سے وابستہ کوئی نہ کوئی ہستی راج کرتی رہی ہے۔''

چونکہ منشی امام بخش تاریخ کا کیڑا تھا، اس لیے کوئی آگے سے بول بھی نہیں سکتا تھا مگر اب اُس نے شہر کے تمام معزز گھرانوں کو بے نقاب کر دیا تھا اور اُس نے مرکزی چکلے کی تاریخ کھولنی شروع کی جو شہر کے بارونق بازاروں کے کنارے پر تھا۔ جہاں محرم کے دس دنوں میں جو ماتم اور سوز خوانی ہوتی تھی اسے دیکھنے دور دور سے تماشائی آتے تھے اور ہر کوٹھے پر ایک سیاہ پوش چاند دکھائی دیتا تھا۔

دونوں اطراف میں بالا خانے ایک خاص ترتیب سے ایک جیسے آرکیٹیکچر میں

بنائے گئے تھے ان کے جھروکوں پر لکڑی کا کام ایک جیسی مہارت سے بنایا گیا تھا جس سے اس ادارے کی اہمیت اور طاقت کا اندازہ ہوتا تھا۔ یہاں تاریخ کی بدرو بسرام کرتی تھی۔ شاید یہ غلط ہوگا یہاں تاریخ کی اصلی پہچان پیدا ہوتی تھی۔

''امام بخش تم تاریخ کے مامے لگتے ہو۔ ہر انٹ شنٹ بات کو تاریخ کی کھونٹی پہ ٹانک دیتے ہو اور ہم خواہ مخواہ متاثر ہو جاتے ہیں۔'' یہ بات احمد نواز انقلابی کی طرف سے آئی۔

''ہاں انقلابی صاحب تمہاری وجہ سے دنیا میں انقلاب ناکام ہو جایا کرتے ہیں۔ مطلب کامیاب انقلاب بھی بالآخر ناکام ہو جاتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟ انقلابِ چین کیا ناکام ہوا ہے؟''

''یہ تمہارا خیال ہے کہ ناکام نہیں ہوا۔ ابھی چند سال انتظار کرو پتہ چل جائے گا۔ ابھی بھی ماؤزے تنگ کی بس لاش اس لیے رکھی ہے کہ اس سے لوگ عبرت حاصل کریں ورنہ چین تو اب سمجھو کہ گیا کہ گیا۔''

''یہ نہیں ہو سکتا۔ وہاں آزادی آ چکی ہے۔ امریکہ، یورپ، ایشیا، افریقہ، آسٹریلیا میں مارکیٹوں میں ہر شے میڈ اِن چائنہ پڑی ہے تو پھر چین تو ساری دنیا کی ضرورت ہے۔''

''انقلابی آہستہ۔ سنو اصل بات اظہار کی آزادی اور زندگی گزارنے کی آزادی ہوتی ہے۔''

''تو وہ تو ان کو ہے۔''

''ہاں ہے لیکن سنکیانگ میں روزہ رکھنے پر پابندی ہے۔''

''وہ تو ہوگی۔ اس لیے کہ جب طالبان اور اُن کے بغل بچے ایشیا میں کیڑوں مکوڑوں کی طرح پھیلیں گے تو پھر کوئی بھی ملک خود کو بچانے کے لیے ایسی بے ہودہ حرکت

تو کرے گا۔''

اب منشی امام بخش وہاں سے اٹھنا چاہتا تھا کہ شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ ویسے تو اس چائے خانے میں صدیاں بیت گئی تھیں لیکن زمانی وقفہ محض ایک گھنٹے کا تھا۔ ایسے میں خلیفہ سرفراز نے چیلنج کیا کہ ''مرکزی چکلے میں ہر نامی گرامی خاندان کی عورت موجود تھی تو کیا ثبوت ہے تمہارے پاس۔''

منشی امام بخش مسکرایا اور سب ہارے ہوئے انقلابیوں اور سوشلسٹ انقلاب کے بچگان اور خوابوں کی دور کی نظر کی عینک پہننے والے راج دُلاروں سے مخاطب ہوا۔

''کیا تمہیں پتہ ہے کہ چکلے کو ایک فلاسفی کے تحت شہر کے معززین نے بنانے کے لیے جگہ دی اور ایک منصوبہ بندی کے تحت انہیں آباد کیا گیا۔ اس علاقے کی پہلی منظم آبادی چکلے ہی کی صورت وجود میں آئی۔''

ریاض گویرا کو فلسفے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ویسے بھی اس چائے خانے کا بیرا تیسری بار یہ پوچھنے آیا تھا کہ چائے اور لگاؤں تو ریاض گویرا غصے میں آ گیا۔:

''مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟ من ٹھار پردیسی۔''

بے چارہ من ٹھار پردیسی میلی آنکھوں سے دیکھ کر کڑوا گھونٹ پی کر واپس چلا گیا۔ ویسے من ٹھار پردیسی کی بھی ایک کہانی ہے۔ وہ کسی وقت آ جائے گی۔ احمد نواز انقلابی اور خلیفہ سرفراز نے بات کو تہہ تک جاننے کے لیے پوچھ ہی لیا۔

''امام بخش اب تم دنیا بھر کے چکلوں یا براتھلز کے متعلق اپنا فلسفہ بتاؤ۔ نہیں تو یہ چائے خانہ اب ہماری شفٹ بند کر کے کھانے کی شفٹ شروع کرنے والا ہے۔''

''تو پھر بیچ میں نہ بولو۔ سنو کہ اس شہر کے شرفاء نے ایک میٹنگ بلائی۔ ویسی نہیں جو غلام عباس کے افسانے ''آنندی'' میں بلائی گئی تھی۔ تو جناب یہ میٹنگ شرفاء نے اس لیے بلائی تھی کہ ایک گرم ہوا کے خطے کے لڑکے جلدی جوانی کا اعلان کرنے لگے تھے اور اس

کے نتیجے میں تین باتیں ہو رہی تھیں۔ نمبر ایک قومِ لُوط کا قصہ وہاں دُہرایا جا رہا تھا۔ نمبر دو حویلیوں کی راہداریوں اور غلام گردشوں میں نوکرانیوں، کنیزوں اور دائیوں کی بالغ، نابالغ لڑکیوں کی جسمانی ساخت کے مطابق اُن کے استعمال کو ضرورت کے مطابق روا رکھا جانے لگا تھا۔ نمبر تین منہ زور جوانی شرفاء کے جھروکوں، ڈیوڑھیوں، دیواروں اور آنگنوں تک پہنچنے لگی تھی۔ ایسے میں پورا شرفاء کا معاشرہ خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اس لیے شرفاء کے لیڈروں نے میٹنگ بلائی کہ شہر کو گندگی سے بچانے کے لیے ایک بدرو بنائی جائے جس میں معاشرے کا سارا گندہ پانی بہہ جائے۔ اس طرح چکلے کا پورا تصور قائم کیا گیا۔''

''یہ کس صدی کی بات ہے؟''

''تاریخ کا صدیوں سے تعلق نہیں ہوتا۔ تاریخ لمحہ لمحہ بنتی ہے اور ایک لمحے میں بھی تاریخ ریکارڈ ہو کر سو سال کو قابو کر لیتی ہے۔''

''یار اس امام بخش نے تو ہمیں نہیں پھنسایا۔ کہانی کو بھی پھنسا دیا ہے۔''

''کہانی کو پھنسایا نہیں جاتا، کہانی خود کو خود الجھاتی ہے۔''

''تو اب آگے بڑھو۔''

''ہاں تو پھر یہ ہوا کہ شرفاء نے چکلے کی منظوری دے دی اور اس کے لیے ایک زمین مختص ہو گئی۔ راج مزدور اور اہلکار کام پر جُت گئے۔ جس طرح تاج محل بنانے کے لیے شاہ جہاں کے حکم پر ہر ہر طرح کا ہنرمند وہاں حاضر ہو گیا۔ ایسے ہی اس چکلے کی تعمیر ہونے لگی اور وہ تعمیر ہو گئی لیکن......''

''اب لیکن کس طرح آ گیا۔ چکلہ بن گیا۔ اب ہم تاریخ کی قمیص کے بٹن کیسے باندھیں۔ وہ تو کھل گئے ہیں۔'' یہ بات خلیفہ نے کہی......

''لیکن اس لیے آیا کہ حضور چکلہ بنانا تو مشکل نہیں ہوتا اُسے بسانا مشکل ہوتا ہے۔''

''تو پھر اسے بساؤ منشی امام بخش۔ یہاں ہم تو اسے بسانے کے لیے نہیں آئے ہوئے۔''

''ہاں یہ بات اچھی ہے۔ تو جناب چکلہ کیسے بستا ہے یہ نہ تو کوئی سعادت حسن منٹو جانتا ہے نہ غلام عباس جانتا ہے۔ یہ صرف تاریخ دان مطلب میں جانتا ہوں۔ سارے سماج کے مامے بنتے ہیں۔ میں اب کھل کے بتاؤں گا۔ سماج کا ماما صرف تاریخ دان ہوتا ہے لیکن تاریخ دان بھی دو نمبر ہوتے ہیں۔ میں دو نمبر نہیں ہوں۔''

''لو جی اب تو امام بخش خود ہی فارغ ہو گیا ہے۔'' احمد نواز انقلابی نے آواز لگائی۔

''کیوں فارغ ہو گیا۔ میں دو نمبر تاریخ دان نہیں ہوں۔ مجھ سے پوچھو نہ پوچھو۔ میں خود بتاتا ہوں کہ چکلے کے قیام کے بعد اُسے چلانا بھی تھا اور چکلہ کبھی بھی کسی بدصورت عورت یا کمی کمین عورتوں کے ذریعے نہیں چلا کرتا۔ چاہے وہ دہلی کا چکلہ ہو یا لکھنؤ کا ہو یا حیدر آباد دکن کا ہو......''

''لو بھئی امام بخش نے تو مسلمانوں کے شہروں اور ثقافت کو ایک دم میں ننگا کر دیا ہے۔''

''میں نے ایسا نہیں کیا۔ ان شہروں نے خود کو ننگا کر دیا تھا۔ خیر ان چکلوں کو بڑے خاندانوں کا خون چاہیے تھا۔ اُن کے نام کا تڑکا چاہیے تھا۔ اب بڑے خاندانوں کا خون ایسے تھوڑا ہی اُچھلتا ہے، وہ تو حویلیوں میں پروان چڑھتا ہے اور اس شہر کی تو پہچان ہی یہ ہے کہ یہاں بڑے بڑے نواب، خان خاناں اور خاندانی جاگیردار رہتے ہیں۔ اب ایسے میں چکلوں پر ان ہی خاندانوں کا حسن سر چڑھ کے بولنا تھا تو ایسا ہوا کہ......''

''لو جی کہانی نے سر نکالا ہے......''

''کہانی یوں ہے کہ یہ زمانہ افغانستان میں کسی پٹھان قبیلے کا تھا اور ہمارے اس

غریب شہر پر افغان پٹھانوں کے سارے قبیلے آباد ہونے کے لیے اپنے چھوٹے چھوٹے لشکر لے کر چڑھ دوڑتے تھے۔ یہاں کے مقامی باشندے عاجزی اور بے وقوفی کے ملے جلے احساسِ کمتری سے اُن کے گورے رنگوں اور قد کاٹھ کے سامنے پالک کے پتے کی طرح لیٹ جاتے تھے اور ایسے میں ایک پٹھان قبیلے نے افغانستان میں چڑھائی کے لیے لشکر تیار کیا۔ اب اُس کا ایک سپہ سالار محمد خان عین وقت پر بغاوت کر بیٹھا اور اُس نے اُس پٹھان شہزادے کو تنہا چھوڑ دیا۔ اب پٹھان شہزادے کا خون جوش میں آیا۔ کبھی کبھی ظالم خون بھی جوش میں آتا ہے اور اکثر آتا ہے تو مظلوم غریب کے پاس کیا رہ جاتا ہے۔ ایسا ہی ہوا کہ محمد خان کہ خوبصورت افغان ماتھے آنکھوں ناک نقشے اور رنگ وشباہت میں گلفام، گُل اندام، گُل جان، گُل مقام کو پٹھان شہزادے نے اپنی تلوار سے قتل کیا اور اُس کی نو بیاہتا بیوی زیتون جان کو اپنے ساتھ کنیز بنا کے ہمارے ہی اسی شہر کی طرف چڑھائی کرتے ہوئے لے آیا۔''

''امام بخش اس طرح کی بے شمار کہانیاں اس شہر کی بنیادوں میں دفن ہیں۔ شہر کو کھودیں ہر پھاوڑے کی چوٹ کے ساتھ ایک عورت کی چیخ برآمد ہوگی۔''

''ہاں احمد نواز انقلابی تم ٹھیک کہتے ہو۔ بس ذرا سانس لو۔ تو پھر یہ ہوا کہ زیتون جان کو ہمارے اس شہر میں پٹھان شہزادہ لے کر آ گیا اور جب اُسے سامنے پیش کیا گیا تو پٹھان شہزادہ اُس کی خوبصورتی کے سامنے ڈھیر ہوگیا۔ اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اُس نے جس باغی سپہ سالار کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اُس کی بیوی بلکہ نو بیاہتا بیوی کیا ہوگی۔ اب وہ پٹھان شہزادہ سامنے آیا اور دونوں میں مکالمہ ہوا......

''میں قبیلے کا شہزادہ ہوں۔''

''تیرے میں ہمارے قبیلے کا خون نہیں ہے۔ معلوم کرو تمہاری ماں کون تھی۔''

''میری ماں پٹھان تھی۔ نہ بھی ہو تو کیا ہے۔ میرا باپ تو پٹھان ہے۔''

"تم لوگ ماؤں کو بھول جاتے ہو۔ انسان کی سرشت میں ماں کا خون بھی شامل ہوتا ہے۔ اگر طوائف ماں ہے تو بیٹا تماش بین بن سکتا ہے۔ نہ بنے تو سمجھو باپ وہ کام کر گیا ہے۔"

"تو پھر تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ میں جو بھی ہوں۔"

"انتقام لینا چاہتی ہوں۔ تم نے میرے بھرے جسم والے بہادر سپہ سالار خاوند کا خون کیا ہے۔ میں اُسی طرح سے تمہارا خون لینا چاہتی ہوں۔"

"لے لو۔ سامنے کھڑا ہوں۔" تلوار کمر سے اُتار کر پھینکتا ہے۔

وہ دیکھتی ہے۔ پھر تلوار کو ٹھوکر مارتی ہے۔

"جس تلوار نے میرے سہاگ کا خون پیا ہو۔ اُسے ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔ تمہیں اس تلوار سے نہیں ماروں گی۔ کسی اور طرح ماروں گی۔"

"تو پھر سُنو میں تمہیں گھر بٹھانا چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟ گھر بٹھانا کس طرح سے ہوتا ہے؟"

"ہمارے ہاں گھر بٹھانا ایک روایت ہے۔ ایک دستور ہے۔ تمہیں نہیں معلوم؟"

"میں نے آپ کے سپہ سالار سے شادی کی تھی۔ اُس کے گھر نہیں بیٹھی تھی۔"

"تو سمجھ لو۔ گھر بٹھانے کا مطلب ہے تم سے شادی نہیں کروں گا۔ تمہیں اپنا حسب نسب اور نام کا کوئی سرکاری رتبہ نہیں دوں گا۔"

"تو میں تمہارے گھر نہیں بیٹھ سکتی۔ کوٹھے اور چکلے پر بیٹھ سکتی ہوں۔"

"تو پھر یہ تمہاری مرضی ہے۔ تم یا میرے پاس بیٹھوگی یا چکلے میں بیٹھوگی۔"

اور پھر زیتون جان نے چکلے کو چُن لیا۔ عام طور پر چکلہ اپنے لیے لڑکی کو چُن لیتا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک عورت نے چکلے کو چُن لیا۔ اب یہ بات چھپی تو نہیں رہ سکتی تھی۔ کوٹھوں اور چوباروں چڑھی اور اس پٹھان قبیلے کے خاندان کے حوالے سے زیتون

جان مشہور ہوئی لیکن کہانی میں ایک پیچ ہے......

''وہ کیا؟ اب کہانی کس لیے روک رہے ہو؟'' سب نے مل کر دہائی دی۔

''وہ یہ کہ زیتون جان جب چکلے کے ایک کوٹھے پر براجمان ہوئی تو سب طوائفوں اور کوٹھے دارنیوں کے کان کھڑے ہوئے کہ یہ کون آ گئی۔ ان کے رزق پر پاؤں رکھنے۔ سب اُس کے کوٹھے پر جمع ہوئیں کہ بی بی مسئلہ کیا ہے۔ تمہاری جو شہرت ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے اس بازار میں سب سے زیادہ بھیڑ بھڑکا اور شور شرابہ تو تمہارے کوٹھے کی سیڑھیوں پر ہوا کرے گا اور تم کتنوں کو سرفراز کرو گی اور کیسے اُن سب کی خواہشوں کو اپنے اندر جذب کر سکو گی۔ اُس بی بی زیتون جان نے سب کی خاطر جمع کرنے کے لیے اُن سے محبت کا اقرار کیا اور تسلی دی کہ میں وہ سب نہیں کروں گی جو یہاں ہو رہا ہے۔ میں کسی کو اوپر نہیں آنے دوں گی۔ یہ تو میرا وہ کمرہ ہے جہاں میں نے اپنی مرضی سے زندگی گزارنی ہے۔ میری مرضی کے بغیر یہاں کوئی نہیں آ سکے گا۔ اس سے آپ کے رزق کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔''

سب سُن کر سُن ہو گئیں۔

''تو پھر یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟'' ایک معصوم سی نوخیز کلی چٹکی۔

''اس لیے کہ مجھے اپنے شوہر کا بدلہ لینا ہے اور بدلہ ایسے ہی لیا جائے گا کہ میں پٹھان قبیلے کے سربراہ سے یہ کہانی لے کر آئی ہوں۔''

اب سب کے خاموش ہو کر تکنے کی باری تھی اور وہ زیتون کو دیکھ رہی تھیں۔

''ہاں مجھے بدلہ لینا ہے اور میں چکلے میں سب سے نامور طوائف یا کسبی ہو چکی ہوں۔ تم سب کو کن کن ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ بولو۔''

''ہمیں پتہ ہے ہمیں لوگ اور شہر والے کیا کیا نام دیتے ہیں لیکن ناموں سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ ہمارے آسرے رہتے ہیں، ہم اُن کے آسرے نہیں۔''

''یہ میں نہیں سمجھی۔''

''مطلب یہ کہ مرد جہاں ختم ہوتا ہے، عورت وہاں سے شروع ہوتی ہے۔''

سب نے قہقہہ لگایا اور کہا ''یہ کیا راز افشا کر دیا تو نے؟''

''ہاں میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے ساتھ کئی دفعہ ہو چکا ہے جہاں میں ختم ہوا تھا، وہاں سے وہ عورت شروع ہوئی تھی۔'' امام بخش نے اعتراف کرتے ہوئے اپنی جوانی کا ایک اور واقعہ سنایا۔ شہر میں موسم گرما ایسے جم کر آتا ہے کہ جیسے شہر کے در دیوار تانبا بن کر تپ جاتے ہوں۔ ایسی ہی ایک گرمیوں کی شیشہ دوپہر تھی۔ جیسے دھوپ نہیں ہر طرف شیشہ چمک رہا ہو۔ میں گلیوں کے گورکھ دھندوں سے گزر کر گھر جا رہا تھا۔ جس گلی میں قدم رکھوں دور دور تک بندہ نہ بندے کی ذات۔ مکانوں کی دیواروں کا ایک لکیر جتنا سایہ بھی نہیں تھا۔ سورج سوا نیزے پر مسکرا رہا تھا۔ میں ایک گلی سے دوسری میں...... اچانک ایک گھر کا دروازہ کھلا، کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ وہ اُسی نیم تاریک ڈیوڑھی میں اکیلی تھی۔ جوانی سے اور پھر گرمی سے جیسے پگھل رہی تھی اور مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ دوسرے ہاتھ سے ڈیوڑھی کے دروازے کو زنجیر لگا دی۔ میرا دَم آدھا اندر آدھا باہر۔ میں اُس کے دھڑکتے ہوئے بے ترتیب دل کی سمفنی سُن سکتا تھا۔ وہ معلوم نہیں کب سے میری یا میرے جیسے کسی نوجوان کی راہ دیکھ رہی تھی۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ بس اسی بات نے اُسے بہادر بنا دیا۔ اُسے بھی نہیں پتہ تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ بس وہ بے تحاشا لپٹنے اور اپنے بدن سے اپنی جوانی نچوڑنے کے لیے بے تاب تھی۔ میں اس گھر سے روزانہ گزرتا تھا لیکن معلوم نہیں تھا اندر کوئی جوالا مکھی موجود ہے۔ اگر میں اس لمحے کے لیے تیار ہوتا تو شاید راستے ہی میں میرے جذبات کا ابارشن ہو جاتا مگر اب تو ایسا تھا کہ جیسے گیلے بالن سے تندور کو گرم کیا جاتا ہے۔ بالن گیلا نہ بھی ہو تو گرم کرنے میں وقت تو لگتا ہے۔ وہ تو جیسے اپنے دونوں غبارے پھلائے بیٹھی تھی۔ میں اُسے صحیح طرح دیکھ بھی نہ پایا کہ ناک آنکھ ہونٹ بھی جسم پر

ہیں کہ نہیں۔ بس بھرے بازوؤں اور بھرے جسم نے مجھے لپیٹ لیا تھا۔ اُس کے پسینے کو میں سانسوں میں بسا چکا تھا۔ مجھے پہلی بار پسینے کے ذریعے ایک لڑکی کو اپنے اندر کے رَس میں شامل کرنے کا تجربہ ہوا۔ یہ پسینہ تو بندے کا رَس ہوتا ہے۔ مجھے یہ بات پہلے معلوم نہیں تھی۔ مجھے لگا شہر کے محلے کی ساری گلیاں میرے جسم میں داخل ہو گئی ہیں اور ان گلیوں کے راستے شہر کی تاریخ میرے خون میں سرسرانے لگی ہے۔ اُس لڑکی نے کچھ بھی نہیں کیا۔ نہ انگیا اُتاری۔ نہ قمیص کے بند کھولے اور اُس کے ہاتھوں کو تو فرصت ہی نہیں تھی کہ اپنے کپڑوں کو ٹٹولے۔ وہ تو بس آنکھیں بند کیے ایک غیر مرد کے جسم سے بھڑ گئی تھی۔ میں اب خود کو محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے لگا میں اور میرا بدن موجود ہیں اور کسی اور بدن کی پُکار کا جواب دھیمی آواز میں دے سکتے ہیں کہ اچانک ڈیوڑھی کے دروازے کی زنجیر کسی نے کھٹکھٹائی۔ دونوں جسم ایک دوسرے کے اندر جہاں تھے، تھم گئے۔ دو دریا طغیانی کے مقام پر آ کر رُک گئے۔ چند لمحے اُس طرح گزرے جیسے چڑھی ہوئی ندی کو راستہ بدلنا ہو تو کچھ لمحے تو لگتے ہیں۔ اُس نے پہلے مجھے چھوڑا۔ میں اُس سے الگ ہوا تو لگا میرا اپنا وجود بحال ہوا ہے۔ نہیں تو میں اُس کے وجود کا حصہ ہو چکا تھا۔ میں نے دروازہ نہیں کھولا۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ دروازہ کھولنا چاہیے یا نہیں۔ میں پھر کہتا ہوں۔ عورت مرد سے بہادر ہوتی ہے۔ مرد عورت کی جوتی ہوتا ہے۔ کسی نے الٹ محاورہ بنا دیا ہے یا شاید یہ مرد کی بدمعاشی اور احساسِ کمتری ہے۔ خیر اس پر تاریخ ہی سے شہادتیں لاؤں گا۔ فی الحال تو یوں سمجھو کہ اُس نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک نابینا گداگر جستی کٹورا لیے کھڑا تھا......

''آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔ کچھ محتاج کو خیرات دے دو۔ دروازے گن کر اس دروازے تک آیا ہوں۔''

اُس نے یہ بات کہہ دی اور میں نے مان لی اور وہ لڑکی بھی دوڑ کر اندر چلی گئی اور چند لمحوں میں رکابی میں آٹا لے کر آئی اور اُس کے جستی کٹورے میں ڈال دیا۔ اب میں نے

اُس کو دھوپ کی روشنی میں دیکھا۔ وہ تو چودھویں کے چاند کی روشنی سے لتھڑی ہوئی تھی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ سارے دریا سمندر میں اتر چکے تھے۔ میں نے اسے دیکھا اور دہلیز سے باہر قدم رکھ دیئے۔ مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا ورنہ پھر وہ ساری گرماہٹ مجھے نہیں ملنی تھی۔

"آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔ کچھ محتاج کو خیرات دے دو۔ دروازے، گن گن کر اس دروازے تک آیا ہوں۔"

یہ آواز میرا پیچھا کرتی رہی اور میں سوچتا رہا کہ وہ نابینا گداگر کس طرح دروازے گِن گِن کر صرف اُس دروازے تک دستک دینے آ پہنچا تھا۔ کیا اُس کے اندر کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

امام بخش نے یہ ساری گفتگو ایسے ردھم میں کی کہ سننے والوں نے پلک نہ جھپکی۔

البتہ احمد نواز انقلابی اتنا بولا کہ "وہ زیتون جان کا قصہ کیا ہوا؟"

"ہاں۔ وہ قصہ یہ ہوا کہ زیتون جان نے کوٹھا سنبھالا اور اُس تک کوئی گاہک آنے کے لیے بے تاب ہوتا تو وہ اُسے بلاتی اور اسے جلدی فارغ کر دیتی۔ اسے انتظار تھا کہ کسی دن وہ پٹھان شہزادہ سیڑھیاں چڑھ کر آئے اور پھر وہ اپنا انتقام لے لیکن وہ پٹھان شہزادہ نہ آیا لیکن ایک دن صبح کے وقت اُس کے کسی ملازم نے اطلاع دی کہ بی بی جان نیچے کوئی کپڑے میں لپٹی نوزائیدہ بچی رکھ گیا ہے۔ بس زیتون جان کو شاید اسی وقت کا انتظار تھا۔ وہ اٹھی اور لپک کر اُس بچی کو سیڑھی سے اوپر لے کر آئی۔ حکم آیا کہ جلدی سے بچی کے دودھ، شہد اور کپڑوں کا انتظام کیا جائے۔ وہ سب ہو گیا تو چکلے کے سب باسیوں کو معلوم ہوا کہ شہر کے سب ناجائز اولادوں والوں کو اگر کسی کوٹھے پر اعتبار ہوا ہے تو وہ زیتون جان کا کوٹھا ہے۔ کبھی اس طرح کی اولادوں کو مسجد کی سیڑھیوں پر رکھا جاتا تھا لیکن یہ پہلا واقعہ تھا کہ کسی نے اپنی بچی کی بہتر تربیت کے لیے زیتون جان کا ہاتھ تھاما تھا۔ زیتون جان کا نام تو پہلے بھی تھا، اب اور اعتماد حاصل کر گیا۔ اب لوگ اپنی بچیاں زیتون جان کی چوکھٹ پر رکھ

جاتے تھے اور وہ بھی ان بچیوں کو بیٹیوں کی طرح پالتی تھی۔"

"دیکھ امام بخش اب بدن ٹوٹ رہا ہے۔ ہمیں اپنے گھر جانا ہے۔ کہانی روک دو یا انجام کرو۔" یہ ریاض گویرا تھا......

"کوئی بات نہیں کہانی ختم پیسہ ہضم...... زیتون جان جیسی آٹھ دس خاندانی کہانیاں ابھی تاریخ کی خورجین میں باقی ہیں لیکن اب تم جاؤ، اس چائے خانے پر وقت آ گیا ہے کہ وہ اب کھانے کے گاہکوں میں تبدیل ہو جائے...... اُٹھو۔ کل بات کریں گے۔"

لیکن ایک بات جاتے جاتے ہو جائے۔ وہ جو مرزا ہادی حسین رسوا کا قصہ ہے "امراؤ جان ادا" تو سُنا ہے اس کے دو مسودے تھے۔ دوسرا مسودہ لکھنؤ کے انیس اشفاق نے کہیں سے دریافت کر کے ناول جڑ دیا ہے "خواب سراب"......

"اچھا تو کیا ہے اُس میں۔" ریاض گویرا چونکا۔

"بھئی اُس میں تو وہ کچھ اور ہی کہانی لکھتا ہے۔ مثلاً اس دوسرے مسودے کی رو سے امراؤ جان کسی معمولی داروغہ کی بیٹی نہیں تھی۔ وہ کہتی ہے "ہمارے پردادا آفتاب الدولہ ولد نواب خورشید بہادر...... ابوالفتح نصیر الدولہ محمد علی شاہ کے زمانے میں ناظم سرکار دولت مدار تھے اور انہیں چودہ پارچے کا خلعت عطا ہوا تھا اور دادا ہمارے سلطانِ عالم واجد علی شاہ کے زمانے میں بندوبست کے مہتمم تھے اور شاہی کارخانے میں ان کا بڑا دخل تھا۔ دونوں کو اپنی خدمتوں کے صلے میں بہت سی زمینیں اور جاگیریں ملی تھیں۔ دادا نے ہمارے...... ہمارے ابا جان نواب علی نقی بہادر کے لیے تحسین گنج میں ایک بڑی حویلی بنوائی تھی اور اُسی متصل ایک آراستہ باغ بھی انہیں دیا تھا۔ دربان ہماری ڈیوڑھی پر آٹھ پہر پہرہ دیتے تھے اور دروازے پر ہمارے ہاتھی بندھے رہتے۔"

"لو جی ایک کردار کئی طرح سے بھی لکھا جاتا ہے۔ امراؤ جان تو کسی معمولی گھر کی نہیں تھیں یا مرزا رُسوا نے اسے دو طرح کی زندگی دینے کی کوشش کی۔ ایک مسودہ عوام کی ہمدردی حاصل کرنے والے کردار کے طور پر اور دوسرا اُمراء کے زوال کے نمائندے کے طور پر۔ تو جناب اب بولو، میری بات کی تصدیق مرزا رسوا نے کردی کہ نہیں۔"

"کس بات کی تصدیق علامہ امام بخش؟"

"یہی کہ ہر چکلے یا کوٹھے کو بڑے خانوادے کے اصلی خون سے جلے چراغ چاہئیں۔ چکلہ کمی کمینیوں سے نہیں سجتا۔ زیتون جان کی کہانی کے لیے امراؤ جان کی سند لایا ہوں۔ اس مسودے کی رو سے تو اب سجے گا امراؤ جان کا کوٹھا۔"

"مگر اتنے ہاتھی اور دربان ڈیوڑھی پر اور پھر بھی اغوا ہوگئی۔ بولو امام بخش۔"

"بھئی ذرا سی چُوک ہوئی تو بھائی جان شہزادیاں جنگل میں راستہ بھی بھول جایا کرتی ہیں۔" امام بخش نے جغادری قصہ گو کا روپ لے لیا۔

"خیر تو پھر امراؤ جان اور کیا کہتی ہے نئے مسودے میں۔" سب نے اصرار کیا۔

"ہاں وہ کہتی ہے، سنو۔"

"اب وہ سناتی ہوں جو اپنے گھر میں دیکھا اور جو کچھ اماں جان نے ہماری بتایا۔ جب میں پانچویں برس میں تھی تو ہمارے امام باڑے کے عَلم میں پانچویں گرہ باندھ کر اماں نے ہمیں پنجتن پاک کی ضمانت میں دیتے وقت بتایا ہماری پیدائش کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا تھا۔ تحسین گنج سے چوک تک فقیروں کو قطار میں بٹھا کر کھانا کھلایا گیا اور غریب غرباء میں اشرفیاں بانٹی گئیں اور حویلی سے باہر والے میدان میں جو آتش بازی چھڑائی گئی تھی اس کا تماشا دیکھنے لوگ دور دور سے آئے۔ گھر کے سارے ملازموں میں بہت قیمتی جوڑے تقسیم کیے گئے۔ جن میں سونے چاندی کے تار پروے ہوئے تھے تو مرزا رُسوا صاحب دن ہمارے عیش و آرام سے گزر رہے تھے۔ چاندی کے پالنے میں ہمیں جُھلایا جاتا

اور چھینک بھی آتی تو ماماییں اور مغلانیاں دوڑی چلی آتیں اور مجھے جھولے سے اٹھا کر ایک سے دوسرے کی گود بدلتی رہتیں۔''

''لو جی یہ تو کہانی بدل گئی۔ کہانی بدلی یا بدلائی گئی ہے۔'' ریاض گویرا نے سوال اٹھا دیا۔

''میاں غور سے سنو۔ میرے حساب سے اصل کہانی یہی ہونی چاہیے تھی۔ لکھنؤ میں اگر نواب زادی کوٹھے پر نہ بکی تو پھر کیا کہانی بنی۔ ایک مظلوم لڑکی کی کہانی...... نہیں مرزا رُسوا کو یہ مسودہ چھاپے خانے کو دینا چاہیے تھا۔''

''بھول ہو گئی یا کوئی تجربہ کیا۔'' کسی نے سوال کیا۔

''نہیں میاں یہ بات نہیں۔ مرزا رُسوا کا یہ مسودہ گم ہو گیا تھا۔ یہ تو بہت بعد میں اس ناول میں دریافت ہوا ہے۔'' امام بخش کو یہ کہنا پڑا۔

''تو پھر اُس نے دوسرے مسودے میں امراؤ کو عام لڑکی بنا کر پیش کر دیا۔ کیوں؟''

''بھئی کہانی کار کو یہ حق تو دو کہ وہ ایک کردار کو دو دو دفعہ لکھے بھلے تین تین دفعہ لکھے۔ اب اگر پہلے ناول نے دھوم مچائی تو دوسرے مسودے کو کون پوچھے۔''

''تو امام بخش ہمارا وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟ رات کے کتے جاگ گئے ہیں۔''

''نہیں ذرا دیکھو کہ پہلے امراؤ جان کیسے اغوا ہوئی۔ اب کیسے ہوتی ہے۔ سنو امراؤ کیا کہتی ہے: ''جو زمینیں اور جاگیریں ہمیں ملی تھیں، ان کی دیکھ بھال کارندے کرتے تھے اور منشی اُس کا سارا حساب کتاب لکھتے۔ اسی میں ہماری زمین جائیداد میں خرد برد ہونا شروع ہوئیں اور جب ابا جان کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے اس کارندے سے جس نے یہ خرد برد کی تھی، باز پرس کی اور اُسے نوکری سے نکال دیا۔ بس اُسی وقت سے اُس نے انتقام لینے کی ٹھان لی۔''

"اب پتہ چلا یہ نواب زادی اغوا کیسے ہوئی اور کوٹھے پر کیسے پہنچی؟" امام بخش نے گویا دوسرے مسودے کا کُھرّا پکڑ لیا۔

"ہاں یہ تو واضح ہو گیا، اب اور کہانی میں کیا اونچ نیچ ہے۔ امام بخش جلدی بتاؤ۔"

"ہاں بس زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

"ہر قصہ گو یہی بکواس کرتا ہے کہ زیادہ وقت نہیں لوں گا اور پھر وہ ہماری نیندیں حرام کر دیتا ہے۔"

"بھائی صاحب اسی کے قصہ گو پیسے لیتے ہیں۔ پھر سمجھو ویسے کہانی کو مختصر کر کے نکلتے ہیں۔" امام بخش نے سفر باندھ لیا۔ "دیکھو فیض علی ڈاکو پہلے مسودے میں بھی تھا اور اس میں بھی ہے مگر اب وہ اور طرح سے آیا ہے۔ وہ امراؤ جان ادا سے شادی بھی کرتا ہے اور بیٹی بھی پیدا کرتا ہے۔"

"لو جی یہ تو پورا مسودہ ہی بدل گیا۔" منصور مہان نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی بدلے، آخری بیان امراؤ جان ادا کا سُن لو۔"

"تو مرزا رُسوا صاحب، اس مکان میں جو کان پور میں فیض علی نے کرائے پر لیا تھا، ہم وہاں بہت دنوں تک رہے۔ سچ پوچھیے تو میں فیض علی کو اندر اندر سے چاہنے لگی تھی اور مشکل وقت میں ان کا ساتھ چھوڑنا مجھے گوارا نہ تھا...... مسجد میں دو مولویوں نے ہمارا نکاح پڑھایا۔ فیض علی نے مجھے اور ان مولویوں کو شیرینی کھلائی اور دو چار اشرفیاں اُن مولویوں کے ہاتھ پر رکھ کر مجھے گھر لے آئے۔ اب میں نے ایک بیوی کی طرح پورا گھر سنبھال لیا۔ اسی بیچ یہاں ایک چاند سی بیٹی پیدا ہوئی۔ میں نے اس کا نام شمیلہ رکھا۔ فیض علی اُس پر جان چھڑکتے تھے۔"

"لو جی ہم سب سمجھ گئے۔ اب بس کرو امام بخش۔"

"ہاں بس کر دیا۔ امراؤ جان کی کہانی کا دوسرا رُخ آپ نے دیکھ لیا۔ یہ میں نے

اس لیے بتایا کہ کہانی خود کو کئی کئی بار بدلتی ہے۔ ہم نہیں بدلتے۔''

''ٹھیک ہے امام بخش، اب یہ دوسرا مسودہ تمام ہوا؟''

''ہاں تمام ہوا۔''

ابھی رات نے بسیرا ہی کیا تھا کہ امام بخش وہاں سے نکلا۔ اب اُسے ایک اور چائے خانے میں جانا تھا جہاں ادیبوں کی ایک منڈلی بیٹھی تھی۔ اس نے سائیکل سنبھالی۔ اس عمر میں بھی وہ سائیکل پر خود کو زیادہ آسودہ محسوس کرتا تھا۔ منشی امام بخش سوچنے لگا کہ اُس کے پاس جو قصے ہیں، وہ تو سب کے سب حقیقی ہیں۔ قصہ تو فرضی بھی ہوتا ہے مگر وہ تو اصلی قصوں کا سوداگر ہے۔ یہ سوچ کر اُسے بہت اطمینان ہوا، ساتھ ہی اپنی اہمیت پر زیرلب مسکرایا۔ عینک کے پیچھے آنکھوں کے بنٹے بھی گھوم گھوم گئے۔ جب منشی خود کو علامہ خیال کر کے اندر سے خوش ہوتا تھا تو گویا شہر کے سنگھاسن پر بیٹھا اپنے سامعین پر شفقت کی نظر ڈال رہا ہوتا۔ اُس کے سامعین گویا اُس کی رعایا تھے، لیکن آج جب وہ نیم تاریک گلیوں سے گزر کر بازار میں آیا تو جہاں چہل پہل اور رونق ہوتی تھی اُس نے اپنی رعایا کو دیکھا جو ایک طرف بازار میں فالودہ، ربڑی، ملائی اور شربت پینے میں گم تھی تو دوسری طرف قیمے کی ٹکیوں، کبابوں اور چانپوں کی سیخوں پر بُھنائی کی خوشبو آرہی تھی۔ کوئلوں کی مخصوص خوشبو چوک میں پھیلی ہوئی تھی۔ منشی اس چوک کے تمام طباخیوں، کبابیوں، حکیموں، حلوائیوں، نان بائیوں اور فالودے قلفی والوں کا ذاتی طور پر دوست تھا۔ اس لیے کہ وہ دن کا پہلا حصہ ان ہی کے ساتھ گزارتا تھا۔ یہ اُس کی شام کی زندگی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ان ہی لوگوں سے مل کر قصے جمع کرتا ہے۔ اُدھر سے گزرتے ہوئے وہ سب کردار اُسے یاد آئے جن سے اُس نے عجیب وغریب قصے سنے اور جمع کیے ہوئے تھے۔ یہ شہر جو تاریخ میں اپنی جڑیں پھیلائے ہوئے تھا، اس کے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایسا واقعہ دنیا کے ہر بڑے تاریخی شہر کے

ساتھ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب تاریخ کروٹ لیتی ہے تو سب سے پہلے ایسے ہی تاریخی شہروں میں کروٹ لی جاتی ہے۔ ایسا اس شہر کے ساتھ بھی ہوا...... جیسا پہلی دوسری جنگ عظیموں میں یورپ اور ایشیا کے بڑے شہروں کے ساتھ ہوا۔ مثلاً لندن، برلن، روم، ماسکو، سٹالن گراڈ، ہیروشیما، پیرس، پراگ، بوڈاپسٹ اور ایسے ہی کچھ اور تاریخی شہر۔

اب جو اس شہر کے ساتھ ہوا، وہ 1947ء میں ہوا کہ اس شہر میں رہنے والے ہندو جو بے حد کمال کے لوگ تھے، وہ جولاہے تھے، وہ کمہار تھے۔ وہ نقاش تھے۔ وہ مٹی سے ٹائلیں ڈیزائن کرتے تھے۔ وہ کھالوں کو صاف کر کے خشک کر کے چمڑے میں تبدیل کرتے تھے۔ ہندو ہوتے ہوئے وہ کیسے سیکولر تھے کہ مسلمانوں کے بزنس میں بھی اپنا حصہ ڈالتے تھے۔ مسلمان تو گائے، بکری، اونٹ کے گوشت سے کام چلاتے تھے، ہندو غریب تو ویسے بھی شہر میں پچھڑی ہوئی قومیت ہوتے ہوئے دالیں کھاتے تھے لیکن رزق کمانے کے لیے وہ اس کام میں بھی شامل تھے کہ کس طرح کھالوں کو صاف کرنا ہے اور اس کے کتنے مراحل سے گزرنا ہے۔

اب ایسا ہوا کہ پاکستان بن گیا یا ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ یہ دو مختلف حقیقتیں ہیں لیکن دوسری حقیقت نے زیادہ معنی پیدا کیا تو اس شہر سے ہندو جو غریب ذاتوں کے تھے، نہ ان کی کوئی حویلیاں تھیں، نہ ان کے کوئی کاروبار تھے۔ نہ ان کے نام کی کوئی بلڈنگ مشہور تھی۔ ہاں کچھ علاقے ان کے نام سے ضرور تھے ورنہ شہر تو افغان پٹھانوں کے ناموں سے مشہور ہوا تھا۔ مقامی باشندوں کا کوئی ذکر اذکار تاریخ میں نہیں ملتا۔ وہ محض رعایا تھے یا پھر جو مقامی باشندے تھے، وہ ان بیرونی حملہ آوروں کے سامنے ڈھال بن جاتے تھے اور شہید ہو جاتے تھے۔ ایسے شہیدوں کے قبرستان منشی امام بخش کو معلوم تھے۔ قبرستانوں کا کوئی شمار قطار نہیں تھا۔ شہر کم اور قبرستانوں کا منظر نامہ زیادہ تھا۔ آدھی سے زیادہ زمین تو مُردوں نے گھیر رکھی تھی لیکن وہ مُردے مُردے نہیں تھے۔ وہ دن میں جاگ اٹھتے تھے اور شہر کے لوگوں میں

شامل ہو جاتے تھے۔ کسی کو معلوم نہیں پڑتا تھا کہ کون زندہ ہے کون مُردہ...... ایسے میں منشی امام بخش نے اپنی عقل کے مطابق سب کچھ دیکھا اور جب 1947ء میں آبادیوں کا تبادلہ ہوا...... کیوں ہوا؟ اس سوال کا جواب منشی امام بخش کے پاس نہیں تھا کیونکہ اُس سے پوچھ کے کسی نے پاکستان نہیں بنایا تھا۔ اس لیے منشی امام بخش کو 1947ء میں بہت بڑا مسئلہ ہوا کہ وہ تو محلوں میں سائیکل پر ہر مذہب کے آدمی کے لیے مددگار تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ ہندو پنساری کی ایک دکان خالی پڑی تھی، غریب ہندو پنساری بھاگ گیا تھا اور ایسے میں اس دکان پر ایک سیدزادے نے دھاوا بولا اور کیا نکال کے لایا۔ ایک سیر دال چنا، دو سیر گھی، پاؤ پاؤ بھر مصالحے۔ ایک سیر چاول...... اور اس کے بعد وہاں کچھ بھی نہیں تھا اور وہ مسلمان پکڑا گیا......

کیا عجیب جرم تھا کہ 1947ء کے فسادات میں صرف دال چاول چرانے پر سید زادہ جیل پہنچ گیا۔ نہ اُس نے کسی ہندو بنیئے کی حویلی پر قبضہ کیا نہ کسی برف خانے کو اپنے نام لکھوایا۔ نہ کسی ہندو جولاہے کی کھڈیاں راتوں رات قبضے میں لے لیں۔ نہ ہی کسی ہندو آشرم کو راتوں رات بورڈ بدل کر یتیموں کے لیے فلاحی ادارے میں تبدیل کیا۔ کچھ بھی نہ کیا۔ صرف دال، چاول، رومال میں باندھنے پر معصوم سیدزادہ جیل میں...... اگلے دن گھر سے مصلیٰ اور تسبیح منگوائی اور بیٹھ گئے پنجتن پاک اور خاص طور پر مولا علی سے مدد مانگنے۔ بارہ اماموں سے لے کر محرم کے سبھی خاص دنوں کی دُہائی بھی دی۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ تیسرے دن ہی اس طرح کے معمولی مجرموں کی سنی گئی۔ کوتوال صاحب نے دفتر میں بلایا اور کہا بس سزا تمام ہوئی اور اب آپ جا سکتے ہیں۔ سیدزدے نے چھوٹ لگائی اور کوتوال کو دعا دے کر بھاگے۔ پیچھے سے ایک سپاہی آیا اور بولا:

"اپنی تسبیح اور مصلیٰ تو لیتے جائیں۔"

"نہیں، وہ میں نے لے لیے ہیں۔" اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا کہ تسبیح اور مصلیٰ وہ

چھوڑ آئے ہیں اور اب اگر لینے کے لیے گئے تو کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں کہ آخر جیل تو جیل ہوتی ہے۔ سید زادہ بھاگ کے گھر پہنچا اور آٹے، دال کا بھاؤ 1947ء نے اُسے سمجھا دیا تھا۔

منشی امام بخش اسی طرح ایک خیال سے دوسرے خیال میں کیسے پہنچ جاتا تھا۔ یہ کچھ مشکل نہیں ہوتا کہ اللہ نے انسان کو یہ سہولت دی ہے کہ وہ کبھی بھی کسی بھی وقت کسی بھی سوچ کا سرا پکڑ لے اور چل پڑے۔ منشی امام بخش کی ساری زندگی اسی سہولت کے تحت چل رہی تھی۔ وہ جب بھی آنکھیں بند کرتا خود کو کسی بھی زمانے میں لے جا سکتا تھا۔ اس وقت سائیکل پر بیٹھے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے بچپن میں چلا گیا۔ عجیب سا بچپن، ایک میلہ تھا جہاں امام بخش ایک ڈھیلے پاجامے اور ڈھیلی سی قمیص کے ساتھ بابا کے ساتھ وہاں گیا تھا۔ غریبوں کا میلہ ہی تو میلہ ہوتا ہے۔ سستے پکوان...... سستی تفریح کے لیے ہر طرح کا سرکس۔ ہر طرح کے ناچ گانے والا سفری تھیٹر۔ بھونپو پر اعلان۔ سسّی پنوں دیکھو، ہیر رانجھا دیکھو۔ بالی جٹی خود بقلم خود سٹیج پر۔ مگر سب پر ٹکٹ گھر کے باہر لائن لگی دیکھی۔ ایک مچان پر گلّا رکھے ایک بونا ٹکٹ بانٹ رہا تھا۔ اُس نے ایک عینک لگا رکھی تھی جس کا پلاسٹک فریم گلابی رنگ کا تھا۔ ایک طرف کی آنکھ کا شیشہ غائب تھا۔ دوسری آنکھ پر پلاسٹک کا کھوپا لگا ہوا تھا۔ اُس پر ٹکٹ نہیں لگا تھا اس لیے امام بخش اسے دیکھ کر محظوظ ہونے لگا۔ جب اس کے ٹکٹ بِک گئے تو گھنٹی اُس نے بجائی جو تانبے کی اس کے پاس رکھی تھی۔ اندر شو شروع ہو گیا۔ امام بخش خیالوں میں اندر کے کھیل کو باہر استاد دین محمد کے برش سے بنائی گئی سسّی اور ہیر کی تصویروں سے سمجھ اور خیال کی آنکھ سے دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ جو ساؤنڈ وہ سن رہا تھا اُس سے وہ پورے ڈرامے کو اپنے طور پر بغیر ٹکٹ دیکھے جا رہا تھا۔ گویا اُس نے ریڈیو ڈرامے کے آرٹ کو سمجھ لیا تھا۔ بونا اب مچان پر غائب ہو چکا تھا کیونکہ اندر اُس کا بھی ایک کامیڈی رول تھا جو وقفوں وقفوں میں چلتا رہتا تھا۔ امام بخش جسے بچپن میں اماموکہتے تھے،

اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ تو میلے میں گم ہو چکا ہے۔ میلے میں گم ہونے کے فائدے اُسے معلوم نہیں تھے۔ اب ایک ایک کر کے اُسے میلہ اپنا اندر کا جلوہ دکھانے لگا۔ اِماموہیر رانجھا کا زندہ ناچ گانا اپنے تصور میں دیکھ رہا تھا کہ اچانک اُس کے من میں کیا آیا کہ ٹینٹ کے ایک طرف کو چل پڑا۔ اُدھر میلے کی رونقیں اچانک غائب ہو گئیں کہ یہ تھیٹر میلے کے جس رخ پر تھا، اس سے آگے کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ وہ اندھیرے میں ٹینٹ کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس میں جا بجا پیوند لگے تھے۔ ایک پیوند بوسیدہ ہو کر وہاں سے سرک گیا تھا۔ اماموں نے اپنا منہ اندر ڈالا تو دیکھا ہیر سہیلیوں کے ساتھ سٹیج پر کورس گا رہی تھی۔ سہیلیوں میں سب کے سب لڑکے تھے زنانہ لباسوں میں۔ مثلاً اللہ دتہ عرف نگینہ، غلام رسول عرف نادرہ۔ شریف حسین عرف کٹاری وغیرہ وغیرہ۔ اماموں نے اپنا منہ سوراخ میں ڈالا اور سارا ڈرامہ دیکھ لیا۔ ڈرامہ ختم ہوتے ہی جو گیس کے ہُنڈے جل رہے تھے، وہ آہستہ آہستہ مدھم پڑ گئے اور امامو اب کسی اور تھیٹر یا کسی اور زندہ ناچ گانے یا موت کے کنویں کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس کے کانوں میں لاؤڈ سپیکروں کی ملی جلی آوازیں گڈ مڈ ہو کر اس طرح آ رہی تھیں، موت کے کنویں میں مدھوبالا کا رقص دیکھو۔ سسّی اور دودھڑ کا بچہ دیکھو۔ ہیر رانجھا لگڑ بگڑ دیکھو۔ بارہ من کی دھوبن ہیر کو دیکھو۔ دودھڑ کی سسّی کو دیکھو۔ آؤ مہربان قدردان آتے جاؤ جاتے جاؤ دودھڑ کی بجلی دیکھو......

اماموان آوازوں کے مونتاج میں گزرتے ہوئے رکا۔ کھیت میں جو کہ باجرے کا تھا سرسراہٹ ہوئی۔ سرسراہٹ میں ایک خاص ردھم تھا اور کچھ آوازیں بھی سرسرا رہی تھیں۔ وہ تجسس میں آگے بڑھا اور کھیت کے کنارے کھڑے ہو کر دیکھنے کی کوشش کی تو وہ آوازیں تصویر میں بدل گئیں۔ ذرا سا باجرے کا ٹانڈا ہاتھ سے ہٹایا تو دیکھا موت کے کنویں میں موٹر سائیکل کے آگے کرتب اور رقص دکھانے والی شاہدہ عرف بجلی زمین پر لیٹی تھی اور اُس کی ٹانگیں اٹھی ہوئی تھیں اور وہ سسکارے لے رہی تھی۔ اس پر ایک بونا بیٹھا ہوا

تھا۔ اماموکے لیے یہ منظر حیرت انگیز تھا۔ وہ چند لمحے تو رکا پھر اس کے اندر کچھ لہریں اٹھیں،
وہ بھاگ گیا۔

امام بخش سائیکل پر ادیبوں کے چائے خانے میں جا رہا تھا۔ بیچ میں یہ ایک یاد گلیوں میں اُس کے آڑے آ گئی اور وہ بچپن میں چلا گیا۔ اب چائے خانہ قریب آ رہا تھا کہ پھر اُس نے دیکھا کہ ایک چڑیا گھر کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ اُس پر لگڑ بگڑ، نیولا، بکرا جو بکری ہے، گیدڑ، کرلا، بھیڑیا اور دودھڑ کا بچہ پنجروں میں بند تھے۔ اُس کے پاس تو ٹکٹ نہیں تھا...... اُس نے باہر صرف تصویریں دیکھی تھیں۔ اُسے تجسس ہوا کہ یہ دودھڑ کا بچہ کیا ہے؟ اگر انسان کا بچہ ہے تو پنجرے میں کیوں بند ہے اور اُس پر ٹکٹ لگا ہوا ہے۔

یہاں بھی ایک بونا ٹکٹ لے کر اندر جانے دیتا تھا مگر یہ وہ بونا نہیں تھا جو اُس نے موت کے کنویں میں کرتب دکھانے والی شاہدہ عرف بجلی کے ساتھ باجرے کے کھیت کی خلوت میں دیکھا تھا۔ یوں تو سارے بونے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اُس نے سوچا اگر ملک کے تمام بونوں کو اکٹھا کر کے ایک شہر میں آباد کر دیا جائے اور وہ شہر صرف بونوں کا شہر ہو تو کیسے لگے گا۔ وہ سیاحوں کے لیے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگا۔ جہاں ان کے قد جیسے مکان ہوں۔ جہاں کے ان کے قد کے مطابق اشیاء ہوں۔ ایسے میں وہ بونا ذرا اِدھر اُدھر ہوا تو اماموا اندر داخل ہو گیا اور سیدھا دودھڑ والے لڑکے کے پنجرے کے پاس گیا۔ ایک بچہ جس کے پیٹ کے ساتھ ایک اور دھڑ لٹک رہا تھا، دھڑ کیا تھا دو چھوٹے چھوٹے ہاتھ دو پاؤں لٹک رہے تھے۔ اماموں نے پوچھا، تمہارا کیا نام ہے۔ وہ خاموش نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر خوں...... خوں کرنے لگا۔ قریب کے لوگ متوجہ ہوئے۔ اماموڈر گیا۔ وہ جانوروں کی طرح پنجرے میں حرکت کرنے لگا۔ اس کا جسم پنجرے میں رہتے رہتے انسان کا جسم نہیں رہا تھا۔ اب وہ کوئی اور مخلوق بن چکا تھا۔ اُس کی زبان نہیں تھی۔ یہ کیسی دنیا تھی جہاں جیتے جاگتے انسان کو جانور میں تبدیل کر دیا گیا اور کسی قانون نے اُسے رہائی نہ دلائی۔ وہ جانوروں کی طرح کھاتا

تھا۔ ایک گاؤں سے دوسرے قصبے اور پھر کسی اور شہر میں پنجرے میں ٹرک یا کسی بھی بیل گاڑی یا گدھا گاڑی کے ذریعے منتقل ہو جاتا تھا۔ اماموحیرت سے اُسے دیکھتا رہا کہ اچانک بونا آیا اور اُسے کندھے سے ہلایا کہ اٹھو شو کا وقت ختم ہو گیا ہے۔

اب امام بخش چائے خانے پہنچ گیا۔ آج جس میز پر اُس نے بیٹھنا تھا اس کے گرد چار پورے ادیب اور دو اونے پونے شاعر بیٹھے تھے۔

"لو جی علامہ صاحب آ گئے۔" تشنہ تُرابی گویا پھریری لے کر جاگے۔ شوق صدیقی گویا کوئی سوال لے کر بیٹھے تھے، کہنے لگے:

"اپنا علامہ صاحب ادب میں جمود طاری ہو چکا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"مجھے ادب کا کیا پتہ ہو۔ میں تو تاریخ کا آدمی ہوں۔ تاریخ کہتی ہے کبھی بھی کسی بھی شعبے میں جمود وغیرہ نہیں آتا۔ جب تاریخ میں جمود نہیں تو پھر کسی شے میں جمود نہیں۔ جب تاریخ چلتی رہتی ہے کیونکہ وقت چلتا رہتا ہے تو پھر کسی بھی شے میں جمود کی بات بے معنی ہے۔ ہاں البتہ بندے بندے کی اپنی کائنات ہوتی ہے، اس کی کائنات میں کسی بھی وجہ سے جمود آ سکتا ہے۔ اگر میں گھر بیٹھ جاؤں، سائیکل نہ چلاؤں۔ یہاں نہ آؤں۔ کتاب نہ پڑھوں تو بس بات ختم...... پیسہ ہضم۔"

"اِدھر پچھلے دس سال سے کسی نے اچھی نظم نہیں لکھی۔ اچھا افسانہ نہیں آیا جیسا منٹو کے زمانے میں آتا تھا۔" فراز عارفی نے ٹکڑا لگایا۔

"دیکھ فراز عارفی تیری بھی ایک کہانی ہے میرے پاس جو منٹو کی کہانیوں سے زیادہ چونکا دینے والی ہے۔ جب تیری اپنی کہانی ایسی ہے تو تم کیسے کہہ سکتے ہو کہانی نہیں لکھی گئی؟"

سب خاموش کے خاموش تکتے جاتے تھے۔ علامہ امام بخش پھر گویا ہوا۔

"جب افسانہ نگار خود افسانہ بن جائے تو پھر وہ زندہ افسانہ ہوتا ہے اور بزدل اتنا

ہوتا ہے کہ اپنی کہانی لکھ نہیں سکتا۔ بات سنو اگر اس شہر کے سب لوگ اپنی اپنی سچی آپ بیتی لکھ دیں تو دنیا حیران ہو جائے گی۔ منافق معاشروں میں ادب جمود کا شکار کیوں ہوتا ہے۔ اس لیے کہ منافقت دل و دماغ آنکھ ہاتھ ہر شے کو جکڑ لیتی ہے تو پھر کیا لکھو گے۔ لکھنے کو کچھ بچتا ہی نہیں۔ اگر تاریخ میں پیچھے جاؤ تو منافقت کم سے کم ملے گی۔ اس لیے......
بڑے سے بڑا سچ ہمیں لکھا ہوا نہ بھی ملے تو روایت ہمیں کہیں افواہوں میں کہیں ہواؤں میں، کہیں دلوں میں، کہیں دل کے دروازوں سے لپٹی ہوئی ضرور ملتی ہے اور پھر وہ زندہ رہتی ہے ہر کسی کی یادداشتوں میں۔ بس تاریخ اسی سچ کو ترستی ہے اور اگر مل جائے تو تاریخ ہری بھری ہو جاتی ہے۔''

''علامہ صاحب بس۔ علموں بس کریں او یار'' شوق صدیقی نے بور ہو کر کہا لیکن تشنہ تُرابی نے آنکھ مٹکائی اور علامہ امام بخش سے کہا۔

''وہ جو فراز عارفی کی کہانی آپ کے پاس ہے، وہ بتا دو۔ کچھ کچھ تو ہم نے سُنی تھی۔ اس کے بعد نہیں معلوم۔''

''میری کہانی میں کیا ہے، کچھ جھوٹ ہے۔ کچھ افواہ ہے۔ کچھ دشمنوں کی سازش ہے......'' فراز عارفی بولا۔

''ہر کہانی میں یہ سارے عناصر ہوں تو وہ کہانی بنتی ہے۔ اس لیے تمہاری کہانی بن گئی۔ اب تم سُنو یا نہ سُنو......'' منشی جمع علامہ نے کہا۔

''تو پھر آج کی شام ہم جمود کے ماروں کو کچھ تو متحرک کر دو'' شوق صدیقی نے محفل کو جگا دیا۔

''فراز عارفی کی کہانی کوئی انوکھی نہیں ہے۔ دنیا کے تمام مردوں کی یہی کہانی ہے۔ اس لیے فراز ہو یا احمد فراز کہانی تو ایک ہی ہے......''

فراز عارفی اٹھا اور باہر نکل گیا۔ وہ کہانی سے فرار چاہتا تھا اور جب کوئی معاشرہ

کہانی سے فرار حاصل کرنا چاہے تو سمجھ لو وہ معاشرہ اپنی موت کو دعوت دے رہا ہے۔ کہانی ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو کسی بھی معاشرے کی زندگی ہوتا ہے۔ کہانی تو انسان کی سانس ہوتی ہے۔ جب کوئی بھی کہانی کو روکتا ہے تو سمجھو وہ معاشرے کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ کہانی کا راستہ مت روکو......

''نہیں روکتے علامہ جی۔ کہانی کو راستہ مل گیا ہے۔ فراز عارفی جا چکا ہے۔''

شوق صدیقی نے جماہی لی اور کہا......

''مگر اب غیبت شمار ہوگی۔ اُس کی کہانی۔''

''ہر کہانی غیبت ہی تو ہوتی ہے علامہ......'' تشنہ ترابی بولا۔ علامہ نے سر کھجایا۔

''ہاں۔ یہ بات تو حق ہے۔ یہ بات تو آپ نے کمال کی کہی ہے۔ ہر کہانی غیبت ہی تو ہوتی ہے۔ اس میں جو لوگ آتے ہیں، ان کا پیٹ ننگا ہوتا ہے۔ ان کی پیٹھ ننگی ہوتی ہے۔ ان کے کپڑے کہانی کار اتارتا ہے۔ وہ چاہے منٹو ہو یا بیدی سب غیبت کرتے تھے۔ کہانی کار اگر خود غرض نہ ہو تو وہ کہانی نہیں لکھ سکتا۔ اگر کہانی کار کو ماں کی کہانی مل جائے تو وہ ماں کو بھی کہانی میں استعمال کر جاتا ہے۔ یہ بات آج کی نہیں داستانوں سے دوستوفسکی سے لے کر مارکیز تک آئی ہے۔ سنو ہر بڑا کہانی کار پہلے اپنے گھر اور گھر والوں کو ننگا کرتا ہے۔ پھر وہ معاشرے کو بے لباس کرتا ہے۔ تب وہ بڑا کہانی کار بن پاتا ہے......'' علامہ اب کُھل گیا تھا......

''دنیا کا سارا فکشن غیبت ہے۔ مطلب......''

''مطلب یہ کہ کسی نہ کسی کی کہانی پیدا تو انسانوں کی زندگیوں میں سے ہوتی ہے اور جب ہم ان کی زندگیوں کو ننگا کرتے ہیں تو یہ غیبت سے بھی بڑا جرم ہے۔'' علامہ امام بخش اپنی دُھن میں بول رہا تھا۔

''چلو غیبت کو اخلاقی جواز تو مل ہی گیا ہے۔ اب بتاؤ فراز عارفی کی کہانی کیا

ہے۔'' یہ بات سب نے مل کر کہی......

''ہاں کہانی لکھنے والے سب کے سب بدلحاظ ہوتے ہیں۔اس بدلحاظی کی سب سے بڑی مثال منٹو تھا جو مرتے مرتے اپنی کہانی بنا گیا۔''

''کیا مطلب؟ کہانی بنا گیا......اور وہ بھی منٹو مطلب سعادت حسن منٹو۔''

''ہاں ایسا ہی ہے۔منٹو نے خود کو کہانی بنالیا تھا۔وہ ایسے کہ اُس کی تیسری بیٹی نزہت، نصرت کے بعد نگہت تھی اور وہ بہت بیمار تھی۔جب منٹو کی بیگم نے منٹو صاحب کو دوائی لینے کے لیے پیسے دیئے تو پھر کیا ہوا؟ وہ دوائی کی جگہ اپنی شراب لے کر آئے اور باتھ روم میں پینے لگے۔جو بچی وہ کموڈ کے پیچھے رکھ دی۔''امام بخش نے بتایا......

''اور اس طرح منٹو خود کہانی بن گئے۔''

''ہاں کہانی تو ایسے ہی بنا کرتی ہے۔کسی نہ کسی انسان کی سچائی کے ساتھ یا کسی نہ کسی انسان کی بے ایمانی کے ساتھ تو اس دفعہ بے ایمانی منٹو صاحب کی تھی......''امام بخش نے بتایا اور امام بخش کافی پرسکون تھا۔چائے خانے کا بیرا چائے رکھ کر گیا۔چائے خانے کا ماحول اداس تھا، اس لیے کہ آخری گاہک ایک ایک کر کے اِدھر اُدھر ہو رہے تھے۔امام بخش کے سامنے صرف تین سامع بیٹھے تھے۔تشنہ ترابی، شوق صدیقی اور محسن ملتانی...... یہ جو محسن ملتانی تھا، یہ نوجوان بلکہ نوخیز شاعر تھا۔اس نے ابھی لمبا سفر طے کرنا تھا جو طے ہوا۔آگے بات کریں گے۔

تشنہ ترابی نے ہاتھ باندھ کے علامہ امام بخش سے کہا''دیکھو چائے خانہ بند ہونے والا ہے۔کیا آپ ہمیں فراز عارفی کی کہانی بتاتے ہیں کہ نہیں......''

''بتاتا ہوں......سن لو۔فراز عارفی شاعر بھی بس برائے نام ہے۔کوئی شخص فراز نام رکھنے سے فراز نہیں ہو جاتا۔بہر حال قلم مزدور ضرور ہے۔بس شاعری کا پیشہ کرتا ہے۔لیکن؟''

"لیکن مطلب؟"

"لیکن مطلب یہ کہ اُس کی کہانی شروع کرتا ہوں......غیبت تو اب ہو گی لیکن میں تاریخ کا قصہ گو ہوں اس لیے یہ میری ڈیوٹی ہے کہ میں مرنے سے پہلے کچھ سچ ریکارڈ کرا دوں۔"

"اب سچ کو روکو گے تو وہ سچ نہیں رہے گا۔ جیسے انصاف ملنے میں دیر ہو جائے تو وہ انصاف نہیں رہتا۔" تشنہ ترابی بولا۔ اگر چہ وہ اس وقت تشنہ نہیں تھا چائے کا گھونٹ لے چکا تھا......

"نہیں سچ کو میں نہیں سچ روک رہا ہے۔ کبھی کبھی سچ کو سچ بھی روکتا ہے۔" امام بخش بولا۔

"لو اب امام بخش حضرت علامہ آپ نے گوٹ پھنسا دی۔" شوق صدیقی نے دُہائی دی۔

"نہیں میں نے گوٹ نہیں پھنسائی۔ کبھی کبھی جو سچ ہوتا ہے وہ زمانے کے قابل نہیں ہوتا۔ یہ سچ بھی وہی ہے لیکن اب آپ کہتے ہیں تو بتا دیتا ہوں۔"

سب کے اندر ایک کمینگی نے سر اٹھایا اور وہ فراز عارفی کی تمام بُری عادتوں اور خصلتوں سے بدلہ لینے کے لیے ہمہ تن گوش ہو چکے تھے۔

"اصل میں آپ بھی جانتے ہیں۔ خدا شاعر کو اچھی شکل نہ دے اور اگر اچھی شکل دے تو ساتھ میں خاندانی شرافت بھی دے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شاعر کی نہ کوئی ذات ہوتی ہے نہ خاندان۔ بس وہ تو شاعر ہوتا ہے۔" شوق صدیقی نے لقمہ دیا۔

"بس تو یوں سمجھو کہ شاعر خوبصورت ہو تو کئی گھر اُجاڑ دیتا ہے اور خود اپنا بھی خانہ خراب کر لیتا ہے۔ گھر کبھی ایسے شاعر کا بستے نہیں دیکھا۔" منشی امام بخش بولے جا رہا تھا۔

"کیسی بات کرتے ہو۔تم صرف مصطفیٰ زیدی کی مثال کیوں دیتے ہو۔اپنے زمانے کا خوبصورت شاعر منیر نیازی بھی تھا۔اُس نے تو کسی کا گھر نہیں اجاڑا۔"

"وہ تو اپنا عاشق تھا۔اسی عشق میں مبتلا رہا۔آس پاس دیکھا ہی نہیں۔میں تو فراز عارفی کی حقیقت بتانا چاہتا ہوں۔سنو یہ جو ایک دور شاعری پر آیا تھا کہ احمد فراز بننے کے چکر میں کسی نے اخباری کالموں کے ذریعے اور کسی نے ٹی وی کے ذریعے گرلز کالجوں کی لڑکیوں کا رول ماڈل بننے کے جتن شروع کر دیئے اور پھر آٹوگراف دینے کو زندگی کی معراج سمجھ بیٹھے۔اگرچہ اس شہر میں اخباری کالم یا ٹی وی نے اتنا غل نہیں مچایا۔لے دے کے ریڈیو تھا یا کل پاکستان مشاعرہ۔فراز عارفی کی اوقات بس یہاں تک رہی۔" منشی نے ابھی سانس ہی لیا تھا کہ شوق صدیقی نے بات اُچک لی۔"یہ سارا کاروبار شروع تو مجید امجد نے کیا تھا۔کیا حسرت بھری نظم "آٹوگراف" لکھی تھی۔اس نے اور شاعروں کے اندر کی حسرت کو بے نقاب کر دیا تھا......"

"ہاں مگر فراز عارفی تو اس کے بعد کی نسل ہے جسے کسی حد تک معصوم سی فرسٹ ایئر سیکنڈ ایئر کی بچیوں کی آٹوگراف بکس تھامنے اور شاعرانہ بالوں کو ماتھے سے ہٹاتے ہوئے مسکرا کر آٹوگراف دینے اور نیچے اپنا فون نمبر لکھنے سے جو عظمت کا احساس حاصل ہوتا تھا کہ اس لمحے کے لیے وہ اپنی ازدواجی زندگی بھی قربان کرنے پر تیار دکھائی دیتا تھا......"

"اتنا وقت تمہید پر کیوں ضائع کر رہے ہو۔ہمیں پتہ ہے فراز عارفی بغل میں بیاض چھاپ شاعر ہے۔خفیہ ایجنسیوں نے اسے معمولی چائے پانی پر شہر کے چائے خانوں اور ہوٹلوں میں مخبری کے لیے رکھا ہوا تھا۔وہ صبح نو بجے سے رات نو بجے تک مختلف ہوٹلوں اور چائے خانوں میں اپنی مخصوص نشست پر بیٹھا ملتا تھا اور اُسے دیکھ کر اکثر نظریاتی اور کھرے ادیب اور شاعر اِدھر اُدھر ہو جاتے تھے لیکن یہ اس کا ذریعہ آمدنی نہ بن سکا کہ خفیہ ایجنسیاں اُس پر اعتبار نہیں کرتی تھیں۔اُس نے مختلف انعامی مقابلوں کو نظر میں رکھا ہوا

تھا۔ مثلاً بچوں کی شاعری کا مقابلہ، حمد و نعت کے مقابلے۔ اقبال پر لکھی گئی شاعری کا مقابلہ۔ قیامِ پاکستان اور ملّی شاعری کا مقابلہ وغیرہ وغیرہ۔ ان مقابلوں میں چھوٹا موٹا انعام مل بھی جاتا تھا۔ حوصلہ افزائی کا انعام پانچ سو روپے سے دو ہزار روپے تک نکل آتے تھے۔ اس لیے کہ ان مقابلوں میں نامی گرامی شاعر بھی حصہ لے لیا کرتے تھے یا اپنے شاگردوں کے نام سے شریک ہو جایا کرتے تھے۔ خیر تو بس اتنی اوقات تھی فراز عارفی کی۔ ہاں مگر ریڈیو کے بھی دو چار چیک مہینے میں مل جاتے تھے۔ وہ ایسے کہ کوئی شاعر وقت مقررہ پر نہیں آیا تو اُسے چانس مل گیا یا کسی پروگرام کا سکرپٹ نہیں لکھا گیا تو اسے ایک آدھ گھنٹے میں لکھنے کے لیے موقع دے دیا گیا۔ اس سے زیادہ ریڈیو پاکستان کو اُس کی ضرورت نہیں تھی۔''

''اب اندر سے کبوتر تو نکالو منشی جی کہ فراز عارفی کی کہانی کیا ہے؟''

ہوٹل میں بیٹھے سب سامع انگشت بدنداں سن رہے تھے مگر کلائمکس تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اس لیے شوق صدیقی کو بولنا پڑا......

''ہاں کبوتر تو نکلے گا۔ ذرا حوصلہ رکھو۔ فراز عارفی اندر سے مکمل فراڈ تھا جس نے احمد فراز اور شاعری کے ساتھ اپنی خوش شکلی کو ایک پیکج میں استعمال کیا۔ اپنے خاندان کی ایک بدقسمت لڑکی اردو کی لیکچرر ہو گئی تھی۔ خاندانی وجاہت میں اس کو بھی حصہ ملا تھا۔ بس فراز عارفی کی والدہ نے کسی نہ کسی طرح یہ رشتہ کرا دیا۔ اب فراز عارفی نے اپنے احساس کمتری کو بیوی کی نظروں میں آٹو گرافوں اور ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں سے برابر کرنے کی کوشش کی۔ شروع میں تو وہ بی بی یہ سمجھتی رہی کہ شاعر ہے اور فراز تخلص رکھتا ہے اور خوش شکل بھی ہے تو شاید معاشرے میں عزت اور گھر میں کفالت اور ذمہ داری کا باعث بن جائے لیکن فراز عارفی کی سرشت میں نیک نامی تھی ہی نہیں اور یوں بھی تخلیقی مزاج صفر تھا۔ مہینے میں ایک آدھ تیسرے درجے کا مشاعرہ اور ریڈیو کا ادھورا چیک کیا معجزہ دکھا سکتا تھا۔ حقیقت کھل گئی بی بی پر مگر آنکھیں اُس بی بی کی دیر سے کھلیں جب دو بچے اُس نے اوپر نیچے

اُگل دیئے......

اُس بی بی کا شاعر سے سامنا ہو چکا تھا اور اُس کے سامنے پاکستان بھر کے سب شاعر ننگے ہو چکے تھے۔ ننگا تو فراز عارفی کئی بار اُس کے سامنے ہوا مگر اُس بی بی نے اُسے عزت لوٹنے میں پس وپیش کیا۔ ایسا گُر عورت کی گھٹی میں پڑا ہوتا ہے۔ یہ بات فراز عارفی کے سان گمان میں نہیں تھی۔ بس دو بچے ہی کافی تھے جو حکومت کا سلوگن تھا ''بچے دو ہی اچھے۔''

یہ دو بچے ہو گئے مگر اچھے تھے کہ نہیں، یہ تو بعد کا معاملہ ہے۔ خیر یوں ہوا کہ اُس بی بی پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ فراز عارفی کی چیرہ دستیاں کھل کر سامنے آ گئیں۔ صبح اور پھر رات صرف یہ دو اوقات اُس کے پاس ہوتے تھے گھر میں......اور وہ ان دو وقتوں میں اپنی گری گرائی اَنا کو سنبھالنے کے لیے جو باتیں کرتا، وہ درج ذیل ہیں:

''تم کیا سمجھتی ہو......ایک لیکچرار۔ صرف سترہ گریڈ کی ٹیچر۔ مجھ سے سارا کالج آٹو گراف لیتا ہے۔''

''مشاعرے میں میرا نام احمد فراز کے بعد لیا جاتا ہے۔''

''مختلف شہروں میں جب مشاعرے کا نام آتا ہے، لوگ پوچھتے ہیں میں آ رہا ہوں یا نہیں۔''

''ریڈیو پاکستان کا پروگرام منیجر میرے نام کو دیکھ کر ریسپشن پر فون کرتا ہے کہ جب میں آؤں تو مجھے بتایا جائے تا کہ میں اُن کا استقبال کروں۔''

''اور ایک بات سن لو......تمھارے سارے خاندان کی سات پُشتوں میں بھی شاعر پیدا نہیں ہوا......شاعر اللہ کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔''

''تم کیا جانو شاعری کو۔ گدھا کیا جانے ادرک کا سواد۔''

وہ بے چاری خاموشی سے یہ سب سنتی رہی کہ ایک دن اُس کے دل کے

دروازے پر دستک ہوئی۔

اب سب چونکے۔ چائے خانے کا ماحول ہی بدل گیا مگر امام بخش نے اپنے بیان کو جاری رکھا۔

دستک کس کی ہوئی۔ ایک افسانہ نگار تھا۔ شاعر کے گھر پر افسانہ نگار نے نقب لگا دی تھی۔ وہ ایسے کہ فراز عارفی کی لیکچرر بیوی نفیسہ کے کالج کی تقریب میں احمد شیراز کو جج کے طور پر دعوت دی گئی۔ خوبصورت قدبُت، سنجیدہ لب ولہجہ، افسانے کاٹ دار۔ شہرت میں ٹیلی ویژن کا کچھ ساتھ بھی تھا۔ تو ایسے میں نفیسہ نے احمد شیراز کو نشست پر بٹھایا۔ احمد شیراز نہیں جانتا تھا کہ وہ فراز عارفی کی بیوی ہے۔ بس نگاہ میں کُھب گئی۔ وہ ایسے کہ احمد شیراز بھی حسرتوں کا مارا ہوا تھا۔ موقع ہی نہیں ملا تھا بیوی کے علاوہ کسی سے محبت کا باب کھولنے کا۔ نفیسہ کے اندر ایک اُداسی، ایک رائیگانی۔ ایک بے سمتی۔ ایک بے وقعتی ایک زمانے سے گلہ سب مل ملا کر اُس بی بی کا ایک رویہ بن چکا تھا۔ احمد شیراز نے جو ذرا پھلیے ہوئے کالج کی لیکچرر سے محبت کے خواب کو سامنے کھڑے پایا تو اپنا فون نمبر والا وزیٹنگ کارڈ آگے کر دیا۔ یہاں سے نفیسہ کے اندر بھی کوئی لہر اٹھی ہوگی یا نہیں، معلوم نہیں مگر ایک دن کسی بہانے سے اُس نے فون کر دیا۔ بہانہ یہ تھا کہ آپ اپنی کتاب بھیجیں تا کہ سٹوڈنٹس سے اُس پر کام کرایا جاسکے۔ بس احمد شیراز کے دل میں بھی اور نفیسہ کے گھر میں بھی دروازہ کھل گیا۔ فراز عارفی کا تو لگا بندھا معمول تھا رات دس بجے کے بعد آنے کا۔ نفیسہ اور شیراز میں تو جنم جنم کی پیاسوں نے آشنائی حاصل کر لی۔ دونوں کی زندگیوں میں لہریں اور ہوائیں اُمڈ آئیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ نفیسہ کے بچوں تک نے اسے اپنے حق میں اچھا شگون سمجھ لیا۔

باپ کو تو وہ جانتے نہیں تھے، ماں کو خوش دیکھنا چاہتے تھے۔ ماں خوش نظر آ رہی تھی۔ بچے لہلوٹ ہو کر ماں اور احمد شیراز کے رشتے میں مگن ہو گئے۔

بس ایک دن فراز عارفی کو کسی کی سفارش پر یا چکر دینے کے لیے انڈیا کے

مشاعرے کی دعوت کا عندیہ دیا گیا اور وہ پاسپورٹ اٹھانے کے لیے گھر میں دوپہر کے وقت آ گیا۔ اُدھر بچے سکول گئے ہوئے تھے۔ چابی اس کے پاس تھی۔ اس نے سوچا بیوی کالج میں ہوگی۔ دروازہ کھولا تو وہاں کمرے میں کوک شاستر کا باب کھلا ہوا تھا اور ایسا منظر تو اس نے کبھی نہ سوچا تھا نہ اس کے فضول قسم کے تخیل میں سماسکتا تھا۔ بس وہ بوکھلا گیا۔ بے معنی قسم کی غیرت اور شاعرانہ عظمت قسم کی بڑبڑاہٹ میں مبتلا ہو گیا اور تو کچھ نہ ہوسکا، طلاق طلاق پیٹتا نکل گیا مگر طلاق کا حوصلہ نہ ہوسکا کہ گھر کا سارا خرچ تو نفیسہ چلاتی تھی۔ معاملہ اُس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ بہت دُہائی خاندان میں دی مگر کوئی بھی فراز عارفی کے لیے کھڑا نہ ہوسکا۔ سب نے شک کا فائدہ نفیسہ کو دیا۔

علامہ امام بخش نے ذرا سانس لیا تو سب نے حیرت سے بات کو اُچک لیا۔

''اسی لیے تو فراز عارفی ڈولتا پھرتا ہے۔ نوجوان طالبات کو آٹوگراف دینے کے شغل کو ہی زندگی کی معراج سمجھ بیٹھا ہے۔''

''چلو اب دکان بڑھاتے ہیں۔ وہ دیکھو چائے خانہ بند ہونے لگا ہے۔''

''ٹھہرو۔ ابھی من ٹھار پردیسی کی کہانی باقی ہے۔ دن کے بچے ہوئے ریزوں میں یہ کہانی بھی پڑی ہے۔ سنتے جاؤ۔''

''لو جی ایک اور کہانی۔''

''یہ من ٹھار پردیسی۔ یہاں سے دور کسی ریاست کی چراگاہ میں چرواہا تھا۔ اپنے ساتھ ایک کہانی لے کر ٹپکا ہے یا شاید کہانی اُسے لے کر یہاں آئی ہے۔ اب وہ یہاں ہماری باتوں کا نشہ کرنے لگا ہے۔ اُس کے کان اور دھیان ہماری طرف ہوتا ہے۔ کبھی کبھی کہانی کہانی کی طرف رجوع کرتی ہے، کشش کرتی ہے۔ الف لیلیٰ کی طرح کہانیاں ایک دوسرے کی سہیلیاں بن جاتی ہیں۔ کسی نہ کسی شہزاد کو بچانے کے لیے۔ تو خیر رات بھیگ چلی ہے تو بیچ میں من ٹھار پردیسی کا قصہ بھی نمٹا ہی لیتے ہیں۔ من ٹھار پردیسی تو اب ہوا ہے

یہ چرواہا تھا۔ اپنی بستی کے ڈھور ڈنگر ہانک کے لے جاتا اور شام سے پہلے سب کو ان کے گھروں تک پہنچا دیتا۔ ان میں ایک گھر سے گائے، بھینس اور دو بکریاں بھی اس ریوڑ میں آ شامل ہوتی تھیں۔ یہ ذرا سے ٹوٹا بھر زمین کا کسان تھا۔ کھجور کے چند درخت، لیموں، انار، مالٹے اور آم کے درختوں کا ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی موجود تھا جسے من ٹھار پردیسی للچائی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ جب وہ اُس گھر کے ڈھور چھوڑنے آتا تو شام کی روشنی میں وہ ایک اور روشنی کی تلاش میں رہتا جو جمالاں کی ہوتی تھی۔ جمالاں اپنے گنے کے چھوٹے سے کھیت ہی میں اُگی تھی۔ اس کا قد گنے کے برابر نکل آیا تھا۔ عمر تو مشکل سے سولہ سوا سولہ ہی ہوگی مگر قد بُت میں شُعلہ اور شیشم کی مضبوطی میں ڈھلی ہوئی تھی۔''

''لو جی اب امام بخش کو ادائیں سوجھی ہیں۔'' غالباً یہ انقلابی تھا...... مزے تو لے رہا تھا مگر عادت سے مجبور تھا۔ اسے کہانی توڑنے میں کمال حاصل تھا مگر امام بخش کہانی توڑنے نہیں دیتا تھا۔ وہ رواں ہو گیا۔

''تو پھر من مٹھار جمالاں کے جمال کا شکار ہو چکا تھا۔ عمر تو من ٹھار کی بھی بس دو چار مہینے اوپر ہی رہی ہوگی کہ اُس علاقے میں گرمائش لڑکے، لڑکیوں کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ اب ڈھوروں کو نکالنے اور واپس چھوڑنے کے سمے من ٹھار کا دل اور بدن اٹک جاتا تھا۔ ایسے میں جمالاں اپنی جھلک دکھا کر باور کرا دیتی کہ وہ بھی انتظار کر رہی ہوتی ہے۔ اب یہ جو تعلق ہوتا ہے اس کو کسی بیان یا بیانیہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ بدن کی پکار ہوتی ہے جو جانوروں جیسی ہوتی ہے۔ پرندوں جیسی ہوتی ہے اور اس بستی میں بھی سب جانور ہی تھے۔ بس جب اندر کی پُکار اٹھی تو جو مِلا اُس پر اپنی بھوک پوری کر لی۔ وہ جانور ہو، لڑکا ہو یا لڑکی ہو۔ کچھ بھی ہو مگر من ٹھار ذرا سا شرمیلا بھی تھا اس لیے اُس نے بدن کی پُکار کو تھوڑا سا سلیقہ دے رکھا تھا کہ کن انکھیوں سے دیکھ ریکھ کر لیتا تھا۔ پھر اداس ہو کر واپس چلا جاتا تھا کہ ایک دن......''

"لو جی کہانی میں موڑ آ گیا۔" اونگھتے ہوئے کسی نے ٹکڑا لگایا۔

اب امام بخش نے حکم لگایا کہ کہانی میں موڑ جب آتا ہے تو کہانی موڑ نہیں مڑتی، سننے والے کو موڑ مڑنا ہوتا ہے اور اب خود کو سنبھالو کہ کہانی ہم سے دامن چھڑانے لگی ہے۔ اب سے آگے کہانی نے خود کو خود ہی سنانا ہے۔

اب سب چاروں درویشوں کی طرح کفنیاں گلے میں ڈالے دیئے کی لَو میں سر نیہوڑائے بیٹھے تھے کہ امام بخش کا طوطی بولنے لگا۔

"تو دوستو پھر یہ ہوا کہ ایک دن جمالاں سامنے آ کر کھڑی ہوگئی اور بولی۔ ڈرتے ہو یا محبت نہیں کرتے۔"

"ڈرتا بھی نہیں اور محبت بھی کرتا ہوں۔"

"تو پھر مجھ سے لپٹ کیوں نہیں جاتے۔ تم بہادر نہیں۔ میں تو بہادر ہوں۔"

"میں نے کبھی کسی لڑکی کو ہاتھ نہیں لگایا۔"

"کبھی تم نے دودھ پر جمی ہوئی موٹی ملائی کی تہہ کو انگلی سے چکھا ہے۔"

"ہاں کئی بار میں نے ایسا کیا ہے۔"

"تو پھر جمی ہوئی موٹی ملائی کی طرح ہی لڑکی ہوتی ہے۔ انگلی سے چکھ لے۔"

پھر من مٹھار نے آنکھیں بند کیں اور گتھ گیا سامنے کھڑی جمالاں سے۔ بالکل ایسے جیسے شہد کی مکھی کسی سے بھڑ جاتی ہے۔ معلوم نہیں کتنے دریا اُس نے جسم میں اترتے اور چڑھتے رہے۔ اب ایسا ہوا کہ گنّے اور باجرے کے کھیت تو کٹ جاتے ہیں۔ آخر کو زمین پر آ کھڑے ہوئے۔ چھپنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ جمالاں کے باپ نے خضاب میں عمر چھپا رکھی تھی اور تہبند میں بچھی کھچی مردانگی...... من مٹھار کا باپ کچہری چڑھا گواہی دینے اور بیچ کچہری گولیوں کی باڑھ کے نیچے آ گیا۔ غلط یا صحیح مارا گیا۔ بین ڈالے من ٹھار کی ماں نے کہ عمر اُس کی مشکل سے چونتیس سال رہی ہوگی کیونکہ من مٹھار جب پیدا ہوا تو ماں سترہ

سال کی تھی اور باقی حساب کتاب آسان ہے۔ ماں کا قد کاٹھ اور کاٹھی مضبوط تھی۔ صبح چاٹی میں لسی بلوتی، ہاتھ کی چکی کا پیسا بیٹے کو کھلاتی۔ ڈھوروں کی دیکھ ریکھ اور دودھ دہی کے سب کام نمٹاتی۔ جسم دھوتی کُرتے سے باہر نکلا پڑتا تھا۔ اس بستی میں عورتیں دُھوتی باندھتی تھیں اور مرد لوگ تیز ہوا چلنے کے موسموں کا انتظار کرتے تھے کہ شاید کبھی نیچے کا بدن دکھائی دے جائے مگر وہ عورت خود ہی بغیر ہوا کے ہوا چلا لیتی تھی جب اُسے دھوتی کے پلو جسم سے ہٹانے ہوتے تھے۔ بیوہ ہونے کے بعد وہ ویسے بھی نکھر گئی تھی کہ اُس کے بدن پر کسی کا پہرہ نہیں تھا۔ اب جب جمالاں کے باپ جیون مہار نے من ٹھار کی ماں مَلکی کو دیکھا تو من میں اُس بیوہ کو آسرا دینے اور بسانے کا خیال محض اس لیے آیا کہ مَلکی ٹھنڈے توے پر بھی روٹی پکانے کی تمازت رکھتی تھی۔ مَلکی پر نظر تو اوروں کی بھی تھی مگر مَلکی کھڑے کھڑے کڑیل جوانوں کو بھی اپنی ایک اُٹھان سے احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اب جو من ٹھار نے جمالاں کے جسم پر ہاتھ ہی نہیں پورے بدن کو تاپنے کی عادت ڈال لی تھی۔ سو دن رات بھوبھل پر دانے کی طرح بُھننے لگا۔ ڈھور ڈنگروں کی رکھوالی کرتے کرتے خود اس کی رکھوالی پہ بستی کے کچھ لونڈے لپاڈے اور بزرگ تعینات ہو گئے۔ خبر کوٹھوں چڑھی اور پھر من ٹھار اور جمالاں کو جیون مہار نے عین عالم جذب و جذبات میں بھوسے کی کوٹھڑی میں بھوسے کے بستر پر دیکھ لیا۔ جمالاں تو گھر میں نظر بند ہو گئی مگر من ٹھار کو بھوکا پیاسا اسی بھوسے کی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ اب مَلکی گھر سے اٹھی اور جیون مہار کے گھر آن کے گرجی کہ اگر اپنی کبوتری کو پنجرے میں نہیں رکھ سکتے تو میرے کبوتر کو کس لیے اندر رکھا ہوا ہے۔ اب جو ملکی سامنے آ کر کھڑی ہوئی اور دھوتی کے اندر سے جسم لاٹیں مارنے لگا تو جیون مہار کے ہاتھوں کے طوطے نہیں کبوتر اُڑ گئے۔ اس نے نگاہ تو ٹکائی ہوئی تھی ملکی پر مگر اتنا معلوم نہیں تھا کہ ملکی کی تپش اتنے قریب سے اسے محسوس ہو گی اور وہ ایسے پگھلے گا کہ اُس کے سارے خضاب اس میں ڈھل ڈھلا جائیں گے اور اندر سے جیون مہار کی ساری

اصلیت باہر آ جائے گی۔
اب جیون مہار نے پہلے تو من ٹھار پردیسی کو بھوسے کی کوٹھڑی سے باہر نکالا اور اسے ملکی کے حوالے کیا مگر دونوں کو روک لیا کہ میری بیٹی کوئی راہ کی گھاس نہیں ہے کہ کوئی اُسے کچل کے نکل جائے۔

''اس چرواہے کے پلے کیا ہے جو میری کسانوں پلی بیٹی کو بیاہے گا۔''
اب یہ بات جیون مہار نے ملکی سے کی تو ملکی نے جواب دیا کہ یہ بات تم اپنی بیٹی سے پوچھو کہ اسے کیسی گرمی نصیب ہوئی ہے میرے بیٹے سے کہ وہ بھوسے میں بھوسہ بننے کو تیار ہوگئی ہے۔

''ہاں ملکی لڑکی کے باپ سے تم یہ بات کر سکتی ہو۔لڑکے والی جو ہوناں مگر یاد رکھو اسی بستی میں کولہو کا بیل بھی ہے اور کولہو بھی ہے۔اس میں اسے پلوا سکتا ہوں۔''
''بڈھے کس بات کا غرور ہے۔ چپہ دو چپہ زمین زیادہ ہونے پر گز لمبی زبان نہیں چلاتے، لپیٹ کے رکھتے ہیں۔''
''کس کو بڈھا کہا ہے۔کھڑے کھڑے تیرے میں سے درجن بچے باہر نکال سکتا ہوں۔''
''خضاب کچا ہو تو بات تو پکی کرنی چاہیے ناں۔آؤ نکالو درجن بچے میں کھڑی ہوں۔بھاگوں گی نہیں آؤ۔ہمت ہے تو میری چادر کو ایک جھٹکے سے اتار دو۔آؤ۔''
اب جیون مہار کی بتی گُل ہو گئی اور ملکی اپنے بیٹے من ٹھار کو جس نے بعد میں پردیسی بننا تھا، لے کر چلی کہ جیون مہار نے آواز دی......
''ٹھہرو ملکی۔تمہاری بات کا جواب ایک طرح سے ہے میرے پاس۔'' وہ مڑی اور سامنے کھڑی ہو گئی۔
''اگر تم چاہتی ہو کہ بھوسے کی کوٹھڑی کی گرمی میری بیٹی تمہارے گھر لے کر آئے تو

ایک تجویز ہے۔''

''ہاں اماں بات سن لو۔'' اب من ٹھار کی چونچ پھڑ پھڑائی۔

''بولو......کیا ہے تیرے پلّے۔'' ملکی بولی۔

''دیکھو اس بستی میں ایک کان میں آواز جاتی ہے تو پوری بستی میں گونج جاتی ہے۔ یہ تو تمہیں معلوم ہے تو یہاں کا دستور ہے کہ لڑکی کے بدلے لڑکی لی جاتی ہے۔''

''کہنا کیا چاہتے ہو۔ میرے پاس بیٹے کے بدلے کی لڑکی نہیں ہے۔ نہ تیرے پاس لڑکا ہے۔''

''یہ سچ ہے مگر تیرے پاس بیٹے کے بدلے لڑکی نہیں مگر تو جو لڑکی سے زیادہ جوان ہے اور اِدھر میں لڑکے سے بڑھ کر ہمت والا ہوں۔ بول کیا یہ ادلے کا بدلہ یا وٹے کاسٹہ منظور ہے۔''

''منظور ہے۔'' اماں جلدی سے بول۔ یہ من ٹھار تھا جسے معاملہ حل ہوتا ہوا محسوس ہوا......

''بکواس بند کرو۔ میں تمہارے نکاح میں آؤں۔ جیون مہار یہ خواب بھی نہ دیکھنا۔ میں بیٹا اپنے آپ پہ وار سکتی ہوں مگر تیرے بستر کی گرمائش نہیں بن سکتی۔''

اب تو کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ ملکی نکل گئی۔ من ٹھار خوف سے دُہرا ہوا اور وہ بھی ماں کے پیچھے نکل گیا۔ اب جیون مہار نے جمالاں کو مٹی کی دیواروں کے پیچھے مٹی بنانے کا پورا ارادہ کرلیا۔ اس لیے کہ اُس کے خوابوں کی ملکی تو اُسے ٹھکرا کر چلی گئی۔ بیٹے کے بدلے ماں وٹے کاسٹہ بنے گی۔ یہ تو علاقے کا دستور بھی نہیں تھا۔ عام طور پر بیٹے کے بدلے بہنیں یہ فرض ادا کرتی رہتی ہیں۔

کہانی آگے چلی مگر لڑکھڑا کر چلی کہ من ٹھار نے ملکی کے آگے خودکشی سے لے کر ہر طرح کا ناٹک کیا مگر ملکی ہڈ کاٹھ کی اور ارادے کی مالک تھی۔ اس نے بیٹے سے کہا، تم مگر مرد

کے بچے ہو تو یا تو جمالاں کو اٹھا کر لے آؤ یا ڈوب مرو......

اب من ٹھار کی اوقات چرواہے کی تھی۔ اس نے جمالاں تک معلوم نہیں پتنگ یا پتنگے کے ذریعے پیغام پہنچایا کہ وہ رات کے آخری پہر گھر سے بھاگ کے کھیتوں کی آخری حد پر شیشم کے بڑے درخت کے نیچے پہنچ جائے۔ وہ ساری رات وہاں راہ دیکھتا رہا۔ جمالاں نہ پہنچی۔ البتہ اُسی رات اس کا باپ جیون مہاران کے گھر پہنچ گیا اور سوئی ہوئی ملکی کی دھوتی ایک جھٹکے سے کھینچ لی۔ ملکی نے جب اپنا ننگا پنڈا دیکھا تو صرف چولی کے ساتھ کود کر کھڑی ہو گئی اور چولی بھی اتار دی اور بولی آ اگر ہمت ہے تو۔ جیون مہار ہکا بکا اپنی ڈب کھولنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ملکی نے زمین پر پڑی درانتی کا ایک وار کیا اور سر دھڑ سے جدا ہو گیا۔ ملکی نے چادر لپیٹی اور درانتی کے ساتھ سر لے کر تھانے پہنچ گئی۔ میز پر سر رکھا اور اونگھتے ہوئے تھانے دار سے کہا "تمہارے پاس عزت لُٹی عورتیں تو روزانہ آتی ہوں گی۔ کسی عزت لوٹنے والے کا سر لے کر کوئی عورت نہیں آئی۔ لے یہ تحفہ رکھ لے اور جیسا بیان دوں، ویسا لکھنا۔ نہیں تو تم جانتے ہو میں کیا کر سکتی ہوں۔" اس پر اُس محرر نے وہی لکھا جو ملکی نے کہا تھا۔ کہانی ختم پیسہ ہضم۔ ملکی جیل میں اور من ٹھار یہاں آ کر پردیسی بن گیا۔ پھر پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا......

اب ریستوران لق ودق خالی۔ من ٹھار پردیسی بھی جا چکا تھا۔ سب نے امام بخش کے اس قصے کو سن کر اپنے اپنے دھیان میں جمالاں اور ملکی کو محفوظ کیا کہ ڈھنڈار راتوں میں یہ خزانہ خیال کو فروزاں کر سکتا تھا۔ جب جانے کے لیے سب اٹھنے لگے تو امام بخش نے کہا "تمہیں چھن چھن کی آوازیں آ رہی ہیں۔ جیسے رقاصائیں مل کر رقص کر رہی ہوں۔"

"نہیں۔ ہمیں تو آواز نہیں آ رہی۔ تمہارے کان بج رہے ہیں۔"

"نہیں یہ آوازیں طبلے کی تھاپ پر کتھک رقص کی محسوس ہو رہی ہیں۔"

"امام بخش اس رات یہاں کسی جنوں کے بادشاہ کی بارات اتری ہے جو تمہیں یہ

سب سنائی دے رہا ہے۔''

''ارے بھولے بادشاہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ جس کیفے میں تم روز آ کر بیٹھتے ہو۔ اس کے پیچھے سینکڑوں یا شاید ہزاروں سال پرانا ایک مندر ہے۔ اس کے آثار موجود ہیں۔ جسے جوشِ عقیدت میں ہم نے مسمار کرنے میں بہت زور لگایا تھا۔''

''ہاں یہ تو یاد ہے۔ جب جب ہندوؤں نے مساجد پر حملے کیے، تب تب ہم نے بھی اپنا غصہ اس مندر پر اُتارا تھا۔''

''اب اُسی مندر سے رقاصاؤں کے رقص کی آوازیں مجھے سنائی دے رہی ہیں۔ ہزاروں رقاصائیں ہمارے شہروں کے مندروں میں رقص کیا کرتی تھیں۔ جن میں اس مندر کے علاوہ سُورج گنڈ کا مندر اور سُورج میانی کا مندر مشہور تھا اور ان میں سینکڑوں، ہزاروں رقاصائیں جسمانی زاویوں سے کہانی سناتی تھیں جسے کتھک کہتے تھے۔ کتھک کتھا سے بنا ہے۔ کہانی بذبانِ بدن۔''

یہ بات سن کر سب ہکے بکے رہ گئے کہ رات کے اس پہر میں امام بخش کیا کہانی لے بیٹھا ہے مگر امام بخش تو جیسے ہزاروں سال پیچھے جا چکا تھا۔ اسے واپس لانا مشکل تھا۔ وہ ان مندروں میں رقص کی موسیقی اور رقاصاؤں کے جسموں کے تمام تر زاویوں کی سمفنی کو بھی سن رہا تھا اور دیکھ بھی رہا تھا۔ کہنے لگا ''تم نہیں جانتے کہ کس شہر میں اُترے ہو۔ یہ شہر اپسراؤں، رقاصاؤں، مغنیوں، موسیقاروں اور دلرباؤں کا شہر رہا ہے۔ بھلے اس شہر میں افغانی برقعوں کو رواج حاصل ہوا ہے مگر تاریخ تو تاریخ ہے وہ مٹتی نہیں۔ کہیں یادداشت اور کہیں کتابوں میں موجود رہتی ہے۔ اسی شہر میں ایک عورت آئی لیکن ذرا ٹھہرو کہ میں تاریخ کو کھول دوں کہ عبدالحلیم شرر جس نے ''فردوس بریں'' جیسا ناول لکھا، وہ ناول آج ہمیں آواز دے رہا ہے۔''

امام بخش کو انقلابی نے روکا۔ ''یہ تم کیا ایک قصے میں دوسرے کو ملا کر سکنجبین بنا

دیتے ہو۔اب ''فردوسِ بریں'' کیوں آیا......''

''وہ ایسے آیا کہ پاکستان میں ایک فرقے کے خلاف دوسرے فرقے نے جب قتل عام کیا تو ''فردوسِ بریں'' کا وہ حصہ یاد آ گیا جس میں مُرشد کسی نوجوان کو خودکش حملے کی تربیت دے رہا ہے۔اب کیا یہ بے معنی ہے۔''

''نہیں امام بخش۔مگر اب ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔''

''انہی باتوں کا وقت رات کو ہوتا ہے۔دن میں کہانی سو جاتی ہے۔اگر کہو گے تو مسافر راستہ بھول جائیں گے۔''

''اچھا تو پھر مکمل کرو۔''

''تو ایسا ہے کہ عبدالحلیم شرر نے 1916ء میں ''پہلی آل انڈیا میوزک کانفرنس'' میں جو صدارتی خطبہ دیا وہ میرے پاس ہے۔''

اب سب کے ماتھے ٹھنکے۔''تو پھر کیا ہے اُس میں؟''

''اُس میں لکھا ہے کہ یہاں رقص وسرود ہزار ہا سال پیشتر سے چلا آتا تھا۔شمالی ہند میں متھرا،اجودھیا اور بنارس اس کے بڑے مرکز تھے۔دکن کے بڑے بڑے مندروں میں بھی اس فن کی بخوبی پرورش ہوتی رہتی تھی۔''

''یہ تو ٹھیک ہے۔ہمارا شہر تو اس میں نہیں آتا۔''

''ذرا صبر۔تمہارا شہر آ رہا ہے۔شرر لکھتا ہے کہ آج سے ساڑھے بارہ سو برس پہلے جب عرب مسلمان سندھ میں آئے ہیں تو تمہارے شہر کے مندر میں سینکڑوں ہزاروں ناچنے گانے والی عورتیں موجود تھیں اور گجرات کے بعض راجاؤں کے ساتھ عورتیں راستے میں مجرا کرتی جاتی تھیں۔''

''اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟''

''اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مجھے پرہلاد مندر میں اس وقت رقص کرنے والی

عورتیں دکھائی دے رہی ہیں اور میں سُن رہا ہوں کہ وہ کس قسم کے رقص پر جسموں کو لچکا رہی ہیں۔"

"امام بخش تم پاگل ہو گئے ہو۔"

"ہاں ایسے رقص کے بعد بندہ پاگل ہی ہو سکتا ہے۔ اب ذرا غور سے سُنو۔ اس شہر میں ہزاروں سالوں کی روایت مٹ نہیں سکتی تھی۔ اس لیے آج میں وہ دیکھ رہا ہوں۔ ابھی میں نے کہا تھا اس شہر میں ایک عورت آئی تھی......"

"ہاں یہ بات ابھی آپ نے کی تھی۔"

"تو پھر اس کا انت بھی جانو۔"

"لو جی سب باتیں آپس میں امام بخش نے ایسی گڈمڈ کی ہیں کہ مجھے تو رقاصاؤں کے اعضاء بکھرے ہوئے لگ رہے ہیں۔"

"ہاں ایسا ہی ہوتا ہے جب تماش بین کسی فن کو دیکھتے ہیں۔ میں نے قصے کے تاروں میں سے تار ایسے الجھائے ہیں کہ تاریخ کے اندر کے حالات تم تک پہنچ جائیں۔ مثلاً میں نے مندروں کی رقاصاؤں کا منظر دکھایا۔ اب ان ہزاروں سالوں کی روایت کو کسی طرح مختلف زمانوں میں تو ظاہر ہونا چاہیے تو ایسے ہی جس عورت کی میں نے بات کی تھی، اُس نے یہ روایت نبھائی۔"

"کون تھی وہ عورت اور کب آئی تھی؟"

"کب کا علم نہیں مگر اس شہر میں آئی اور اس نے پہلی بار حکم لگایا کہ مجھے گلناز کنجری کہہ کر پکارا جائے۔"

"یہ کیا بات ہوئی ہرنا چنے والی کنجری ہوتی ہے۔"

"اوئے انقلابی اس بات کے لیے جگرا چاہیے ہوتا ہے کہ کنجری خود کو کنجری کہلوائے تو اب ایسے ہوا کہ گلناز کنجری نے حکم لگا دیا کہ جو بھی آئے اسی نام

سے مجھے پکارے۔"

"امام بخش مگر اُس نے ایسا کیوں کہا؟"

"وہ اس لیے کہ مردوں کو لذت اپنی مرضی کی چاہیے ہوتی ہے اور جب وہ کسی بھی عورت کو کنجری کہہ کر اور سمجھ کر سواری کرے گا تو کئی گنا اُس کے اندر کی مردانگی کو سرخاب کے پَر لگ جائیں گے۔"

"ہوگی کوئی بابا بلھے شاہ کی دیوانی۔ کنجری نبڑ دیاں میری عزت نہ گھٹ دی۔"

"نہیں۔ اُس نے بابا جی کا کلام نہیں پڑھا تھا۔ یہ اُس کے اپنے پیشے سے عزت کا رشتہ تھا۔ اب ایک اور بات سنو۔ اب سب اونگھتے ہوئے چوکنے ہو گئے کہ امام بخش اب بخشنے والا نہیں تھا۔ یہ جو ہمارے شہر کے مندروں کی رقاصائیں تھیں، وہ کہیں نہیں گئیں۔ ان ہی گلیوں کوچوں میں کسی نہ کسی شکل میں اور اُس بازار میں موجود ہے لیکن ایک اور حقیقت بہت اندر کی ہے۔"

"اب اندر کی حقیقت کیا ہوتی ہے؟"

"یہ وہ حقیقت ہوتی ہے جو ہزار میل دور سفر کر کے پہنچتی ہے اور اپنا اظہار وہاں کسی اور شکل میں کرتی ہے۔ جو رقاصائیں یہاں ہزاروں سال پہلے تھیں، اُن کے رقص کے سارے زاویے ہندوستان میں کھجراؤ کے مندروں کی دیواروں پر پتھر پہ کندہ ہو چکے ہیں۔ وہ تمام زاویے جو رقاصائیں بدن سے لگن اور لگاوٹ کی ہزار قسموں پر عبور رکھتی تھیں، انہیں کسی مجسمہ ساز نے وہاں منجمد کر دیا ہے۔ وہ ہزاروں سالوں سے وہاں پتھر بن چکی ہیں۔ کسی دن کوئی منتر پھونکے گا اور وہ رقاصائیں پھر سے حرکت میں آ جائیں گی۔ کھجراؤ کی یہ مُورتیاں وہی ہیں جو ہمارے مندروں میں ناچتی تھیں۔ اب خاص نشانی دیتا ہوں۔ یہ رقاصائیں کمر سے پتلی پتنگ اور اپنے پیچھے سے مُدور اور گول جیسے پھُولا ہوا فٹ بال۔ اور چھاتیاں وجود سے باہر نکلتی ہوئی۔ مُدور اور کَسی ہوئی۔ چاہو تو ان کے بیچ سُکھ کی نیند سو جاؤ۔

یہ کھجراؤ کی وہ رقاصائیں ہیں جن کا تخیل ہمارے شہر سے گیا اور مجسمہ سازوں نے انہیں دیواروں پر ہر اُس لگن کے زاویئے میں بنایا جو عورت کے ہُنر کی ضمانت دیتا ہے۔ اسی لیے تو میں نے بولا کہ کائنات عورت کے بدن سے پیدا ہوتی ہے۔ جہاں مرد ختم ہوتا ہے، عورت وہاں سے شروع ہوتی ہے۔"

اب تقریباً نیم جان انقلابی اور منصور مہان نے احتجاج کیا "امام بخش تم جھوٹ بھی اتنے اعتماد سے بولتے ہو کہ یقین کرنا پڑتا ہے۔ کہاں کھجراؤ، کہاں ہمارا شہر۔ ہم گُم متھان سنتے رہتے ہیں۔"

"دیکھو یہ بات نہ کرنا...... دنیا میں بہت سے معجزے ایسے ہیں جو سوچ کہاں گئے اور مکمل کہاں ہوئے۔ اب ذرا دھیان سے سنو، ثابت کرتا ہوں۔ یہ جو اپنے شہر کا چکلہ ہے، میں نے بتایا تھا کہ اُس کی تاریخ ہزاروں سال پہلے سے چل رہی ہے۔"

"مگر اس چکلے کی تعمیر تو مشکل سے سو سال کی بھی نہیں ٹھہرتی۔"

"ارے بھولے بادشاہ، تم تاریخ کو نہیں جانتے۔ اس کی جڑیں برگد کے درخت کی طرح صدیوں میں پھیل جاتی ہے۔ پتہ تھوڑی چلتا ہے۔ اب تم سب اپنے شہر کی نشاط روڈ کو جانتے ہو۔ سڑک کے دورویہ کوٹھے، بازار۔ پہلے بتا چکا ہوں کہ ایک منصوبہ بندی سے بنائے گئے۔ اب تمہیں پیچھے ہزاروں سال لے جاتا ہوں۔ ابن بطوطہ کا نام تو سُنا ہوگا۔ وہ چکلوں کی تاریخ سے پردہ ہٹاتا ہے۔ ہمارا بازار نشاط روڈ ہے۔ ابن بطوطہ جس بازار کا ذکر کر رہا ہے اس کا نام "طرب آباد" ہے۔ میں تو سند لاتا ہوں اور یہ سند بھی عبدالحلیم شرر نے اُسی مضمون میں دی ہے جو ہندوستان کی موسیقی پر ہے۔ ابن بطوطہ سلطان محمد تغلق کے عہد میں (جو 725ء سے 752ء تک رہا) اپنے سفرنامہ میں دیوگڑھ کے اندر جس کا محمد تغلق نے دولت آباد نام رکھ دیا تھا، اربابِ نشاط کا ایک مخصوص بازار بتاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"اس شہر میں مغنّیوں اور مغنیہ عورتوں کا ایک بازار ہے جو "طرب آباد" کہلاتا

ہے اور تمام بازاروں سے زیادہ بارونق ہے۔ اُس میں سڑک کے کنارے کنارے بہت سی دکانیں چلی گئی ہیں۔ ہر دکان کے پیچھے مکان ہے جس کا دروازہ ایک گلی میں ہے۔ اس دکان میں پرتکلف فرش بچھا رہتا ہے اور اس کے بیچوں بیچ میں ایک بڑا سا ہنڈولا ہوتا ہے۔ اُس میں مغنیہ عورت بناؤ سنگھار کر کے بیٹھتی یا لیٹ جاتی ہے اور اُس کی لونڈیاں اُس ہنڈولے کو جھلاتی رہتی ہیں۔ بازار کے بیچ میں ایک بڑا بھاری بُرج بنا ہے جس میں مغنّیوں کا چودھری ہر جمعرات کو نمازِ عصر کے بعد آ کے بیٹھ جاتا ہے۔

اُس کے غلام اور خدام سامنے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں اور گانے والیوں اور مغنّیوں کے طائفے یکے بعد دیگرے آ کے اس کے سامنے مجرا کرتے ہیں۔ مغرب کے وقت تک رقص وسرود کی محفل گرم رہتی ہے۔ اس بازار میں متعدد مسجدیں ہیں جن میں ماہِ مبارک رمضان میں تراویح ہوتی ہے۔ بعض ہندو راجہ جب ادھر سے گزرتے ہیں تو اس بازار کے بُرج میں اترتے اور مغنیہ عورتوں کا گانا سنتے ہیں۔ بعض مسلمان بادشاہوں نے بھی اس بازار اور اس برج میں بیٹھ کے رقص وسرود کا لطف اٹھایا ہے۔''

''یہ جو کچھ میں نے پڑھا ہے یہ ابنِ بطوطہ کا لکھا ہوا ہے۔ اب ذرا اپنے شہر کے چکلے کو دیکھو، کیا ہو بہو یہ نہیں ہے۔''

اب کا ٹو تو لہو نہیں۔ سب امام بخش کو تکتے تھے۔ سوال کرنے کا یارانہ تھا۔

''تو سُنو ہمارے اس چکلے کے اطراف میں مساجد ہیں اور تھیں تو اذان کے وقت سب کچھ موقوف ہو جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اختلاط بھی...... اور پھر جیسا کہ ابن بطوطہ لکھتا ہے، ہمارے اس بازارِ نشاط میں بھی ماہ محرم کا مکمل احترام واجب تھا۔ جیسا بتایا کہ سوگ، گریہ، بین اور سینہ کوبی کی روایت برابر چلتی تھی۔ پہلی محرم سے کھاٹ کھٹیا اُلٹ دی جاتی تھی۔ نیا کپڑا خریدنا پہننا ممنوع ٹھہرتا۔ خیرات، نیاز اور تبرک کے ساتھ سبیلوں کا سلسلہ بازار میں عام ہو جاتا۔ مجالس اور ذکر اذکار کے لیے باقاعدہ چنیدہ ذاکرین، نوحہ گر، ماتمی ٹولیاں، مرثیہ گو

اور سلام پڑھنے والوں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ آٹھویں، نویں اور دسویں محرم کے جلوس اس بازار میں نکلتے اور سیاہ پوش عورتیں کوٹھوں سے اُتر کر ماتم کرتے ہوئے بازار میں بے نقاب ہو جاتی تھیں۔ تماش بینوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے تھے اور ایسے ہی ماہِ رمضان میں کوٹھوں پر تالے پڑ جاتے تھے۔ افطار اور سحر کے اوقات میں خوب پکوان بنتے، ایک کوٹھے سے دوسرے کوٹھے تک رکابیاں، طشت، قابیں، ڈونگے اور خوان کشیدہ کاری کے رومالوں سے ڈھک کر ایک کوٹھے سے دوسرے کوٹھے میں جاتے آتے رہتے تھے۔ سحری اور افطار کے وقت نیچے بازار میں ڈھول اور تاشے کے ساتھ اعلان کرنے والوں کے پھیرے لگتے تھے اور کچھ زیادہ ہی لگتے تھے کہ شاید کوئی اوپر سے چاند نکل آئے۔ ایسے میں ان پھیرے والوں کے لیے انعام مقرر تھا جو انہیں مل کے رہتا تھا۔ تو اب بولو، یہ جو ہم نے اس بازار کو چکلے کا نام دیا تو کیا یہ ہماری گندی ذہنیت تھی یا اس لفظ کو بے توقیر کر کے ہم نے عورتوں کی عزتِ نفس کو مجروح کیا۔''

اب رات ڈھلنے پر تُلی ہوئی تھی۔ ریستوران کے باہر کتوں نے جمع ہونا شروع کر دیا تھا کہ شاید کچھ بچا کھچا مل جائے تو سب نے بغیر سلام دُعا کے جانے کا قصد کیا۔ جب محفل کی ٹکڑی بکھرنے لگی تو امام بخش نے آواز دی۔

''ایک کہانی اس سے جڑی ہوئی ہے۔ سننا چاہو گے تو کل عین اسی جگہ آ کر بیٹھنا۔ کہانی عجب ہے۔ پھول والوں کی حویلی......اس بازار کے بازو میں تھی۔ اب یہ کیا کہانی ہے۔ یہ تو کل ہی سناؤں گا۔''

اب جاتے جاتے انقلابی نے طعنہ دیا۔ ''امام بخش تم روایتی قصہ گو ہو۔ کہانی کو ایسے موڑ پر ختم کرتے ہو کہ سننے والے کا وہیں بستر بچھانے کا مَن کر جاتا ہے۔''

''ہاں تو اب تم لوگ سوچ لو، کہانی ایسی ہے کہ......''

''جیسی بھی ہو ہم کو تو آنا ہے۔''

سب نکل گئے۔ امام بخش بچے کھچے دن کے سارے ریزے سمیٹ کر گھر آ گیا۔ وہ اکیلا تھا جو شہر کی تاریخ کا بوجھ اٹھائے پھرتا تھا اور پھر اُسی بوجھ کے نیچے دَب کر سو جاتا تھا۔

اب اگلا دن بھی آن پہنچا۔ دنیا اور شہر ویسے شروع ہوا جیسے ہوتا ہے۔ امام بخش بھول بھی گیا کہ اُس نے قصہ کہاں روکا تھا۔ وہ کوئی ایسی کتاب پڑھ رہا تھا جس میں موسیقی اور خلیفہ ہارون رشید کا ذکر آ گیا۔ امام بخش نے کیا پڑھا......

ہارون رشید نے ایک مرتبہ ایک استاد مغنی سے پوچھا:

''ابنِ جامع کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

کہا ''شہد کا پوچھنا ہی کیا؟ جب چکھئے منہ میٹھا ہو جائے گا۔''

پوچھا ''اور ابراہیم کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے؟''

جواب دیا ''وہ ایک چمن ہے جس میں ہر رنگ کے پھول ہیں اور ہر طرح کی خوشبوئیں مہک رہی ہیں۔''

ہارون رشید نے کہا ''تو اب ابنِ محرز کے بارے میں بھی اپنی رائے بتا دو۔''

عرض کیا ''اُس کی شان یہ ہے کہ جو شخص مزا چاہتا ہو وہی اُس میں لے لے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ انسان کے دل میں سے نکل کے آیا ہے اور دریافت کر لایا ہے کہ اُسے کہ کیا چیز بھلی معلوم ہوتی ہے۔''

امام بخش یہ سب کچھ پڑھ لیتا اور اندر خون میں گھول لیتا تھا۔ پھر اُس کے خون میں سے حرکت کرتی کہانیاں باہر آ جاتی تھیں۔ اب وہ جب قلعہ کے اُس ریستوران پر آیا تو وہاں پہلے سے ٹکڑی جمع تھی۔ ان کے سامنے من ٹھار پردیسی چائے لگا رہا تھا مگر ایک لمحے بعد انقلابی نے پوچھا من ٹھار پردیسی کبھی ماں سے ملنے جیل گیا ہے تو من ٹھار پردیسی اچانک ٹھٹھک گیا کہ یہ کہانی کیسے باہر آ گئی مگر امام بخش تو سُرنگ لگا کے کہانی نکال لایا تھا

جیسے پیرا ہاتھ ڈال کے پتلا سانپ پکڑ لاتا تھا۔

"یہ بات کس نے بتائی؟"

"یہ میں نے بتائی۔ چائے لگاؤ۔" یہ امام بخش تھا......

اب من ٹھار پردیسی تو نکل گیا اور امام بخش کے سامعین نے اعتماد حاصل کیا......

جب من ٹھار پردیسی چائے لگا رہا تھا تو امام بخش نے اُسے روک لیا۔

"من ٹھار دیکھو ہم سب بھی پردیسی ہیں۔ سب اپنے آپ سے بچھڑے ہوئے ہیں۔ کوئی خاندان سے، کوئی خود سے، کوئی سماج سے، کوئی کائنات سے۔ تو تم خود کو اکیلا نہ سمجھو......اب جب تم ماں سے جیل میں مل کے آئے ہو تو احوال بتا دو۔"

اب من ٹھار نے سب کو دیکھا کہ اچانک ایک بیرا کہانی کا کردار بن چکا ہے تو وہ رونے لگ گیا اور جب رو چکا تو کہنے لگا "آج گیا تھا جیل میں...... ماں سے ملاقات کا دن تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"ماں پنجرے میں بیٹھی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ کہنے لگی "تم نے نوکری کر لی، اچھا کیا۔ اب اگر تم جمالاں سے محبت کرتے ہو تو اُسے بھولنا مت۔ ہمت ہے تو اُسے لے آنا۔ میری تو جو بھی سزا ہے چلے گی۔ میری تو زندگی بھی سزا ہی تھی مگر من مٹھار جاؤ اور اگر ہمت ہے تو جمالاں کو لے آؤ اور میری سزا خود بخود ختم ہو جائے گی۔"

اب محفل خاموش تھی کہ امام بخش آ گیا......اس پر محفل میں سے کسی نے یاد دلایا کہ پھول والی حویلی کا کیا قصہ تھا۔ امام بخش کو یاد آ گیا۔ "کیا تم نے سنا ہے یہ ایک حویلی ہے اور اُسے پھول والی حویلی کہتے ہیں تو حقیقت اس کی یہ ہے کہ جہاں چکلہ ہوگا وہاں پھول والوں کی دکانیں بھی ہوں گی۔ پان والی گلی بھی ہوگی۔ کباب اور گلاب کا تال میل بھی ہوگا کہ غلام عباس جو کہانی کار ہے وہ ثابت کرتا ہے "آنندی" افسانے میں کہ بازار،

بالا خانے، کوٹھے اور چکلے دراصل سماج کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں اور وہ سماج کا نہیں سماج اُن کا حصہ ہوتا ہے۔''

''یہ لیکچر دینے کا بہت شوق ہے امام بخش کو۔'' کوئی ایک بولا۔

''کہانی بے صبروں کے لیے نہیں ہوتی۔ بہر کیف اس بازارِ نشاط کی کوکھ سے کئی گلیاں نکلتی ہیں۔ ان گلیوں میں چھوٹے چھوٹے کئی کاروبار پلتے رہتے ہیں۔ کسی گھر میں کبابوں کا قیمہ بن رہا ہے تو کسی گھر میں پان کا قوام تیار ہو رہا ہے۔ کسی گھر میں پکوان تیار ہو رہے ہیں۔ کسی گھر میں آلو کی ٹکیاں تو کسی گھر میں سری پائے بن رہے ہوتے۔ ان سب کو گھر کی خواتین اور لڑکیاں تیار کرتی تھیں۔ یہ سب پکوان شام کو دکانوں کی زینت بن جاتے تھے۔ جہاں گاہکوں اور تماش بینوں کے غول کے غول ٹوٹے پڑتے تھے۔ بازار چہک اٹھتا تھا۔ ایسے ہی پھولوں کے ہار اور گجرے بھی ان گلیوں کے گھروں میں تیار ہوتے تھے۔ یوں تو شہر میں مالنیں اور گجریاں پھولوں کے ہار بناتی تھیں اور مخصوص گھروں میں پہنچاتی تھیں۔ بدلے میں بخشش حاصل کرتی تھیں۔ گھروں میں وہ پھولوں کے ہار پانی کے گھڑوں کے گلے میں ڈالے جاتے تھے۔ کچا صحن ہو یا پکا گرمیوں میں چھڑکاؤ سے مہک اٹھتا تھا...... لیکن ان گلیوں میں ایک گھر ایسا تھا جسے پھولوں والی حویلی اس لیے کہا جانے لگا کہ اس گھر کی خواتین موتیے، چنبیلی اور گلاب کے ہار اُس بازار کی دکانوں کے لیے پروتی تھیں۔ دن بھر کی محنت کا معاوضہ ان کے لیے کنبے کے اخراجات کے لیے کچھ سہولت کا باعث بن جاتا تھا۔ جب گھر کے مرد باہر چلے جاتے تو سب گھر کی عورتیں مل بانٹ کر پھولوں کی چنگیر خالی کر کے ہار تیار کر لیتی تھیں۔ گھر میں مردوں کا شغف پڑھنے لکھنے کا تھا۔ کتابیں بھی قطار اندر قطار ہوتی تھیں۔ جب اس گھر کا نام پھول والی حویلی پڑا تو گھر کا ایک بیٹا شاعر بن چکا تھا اور مختلف جگہوں پر اٹھتے بیٹھتے شاعروں میں اُس کے کلام نے مقامی شہرت پائی۔ اب اس کا دل بھی مچلا کہ کسی طوائف کے کوٹھے کی شکل دیکھے۔ ایسے میں اُڑتی اُڑتی خبر یہ بھی تھی کہ ایک مغنیہ کو

شاعری کا شوق چرایا ہے۔ وہ امراؤ جان ادا تو نہیں بن سکتی تھی مگر کچھ اُڑنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ انہی دنوں میں لاہور کے ایک فلمی شاعر کا بستر بھی گرم کر آئی۔ وہ اسے شاعرہ تو نہ بنا سکا۔ ایک فلم ساز کے ذریعے ایک کلاسیکی راگ راگنی میں الاپ کا موقع مل گیا۔ وہ گیت گلیوں، بازاروں اور کوٹھوں پر چڑھا۔ ریڈیو سے اُس مغنیہ کا نام بھی مقبول ہوا تو اُس کے کوٹھے پر بھڑوں نے گویا چھتہ بنالیا۔ اب کیا ہوا کہ شہر میں استاد بڑے غلام علی نے چکر لگایا کہ شاید کراچی کے بعد کہیں ان کا دل لگ جائے۔ اُس وقت یہ شہر گویوں اور مغنیوں کا لاہور کے بعد دوسرا مرکز تھا۔ اگرچہ نہ ریڈیو تھا نہ فلمیں تھیں۔ پھر بھی زمیندار اور جاگیرداروں کا معمولی سا آسرا تھا کہ کسی بے سُرے تاریخ دان نے اس ہمارے شہر کو چھوٹا لکھنؤ محض اس لیے کہہ دیا تھا کہ یہاں تعزیہ اور عزاداری کا سلسلہ باقاعدگی سے پوری روایت کے ساتھ نبھایا جارہا تھا۔ اب ایسے میں استاد سلامت علی خان، نزاکت علی خان اور کچھ اور گھرانے بھی اُٹھ کر آباد ہو گئے تھے۔ ایسے میں اُس مغنیہ سے ملنے بڑے غلام علی خان اور سلامت علی خان بھی جاتے رہے تھے۔''

''پھول والی حویلی کہاں گئی......'' بلکتے ہوئے منصور مہان نے کہا۔

''صبر کا دامن پکڑو۔ وہ جو شاعر پھول والوں کی حویلی سے ایک دن نکلا۔ عاشق مزاج تھا۔ بال بھی شاعروں کی طرح بڑھا لیے تھے۔ شکل کا نمکین تھا۔ مسکین شکل بنا کے رکھتا تھا۔ پڑھا لکھا تھا۔ لاہور کی ہوا کے ساتھ اس مغنیہ شاعرہ کی عزت لوٹنے کی ہوس بھی تھی۔ اب سوچو کہ جس کے گھر کی خواتین دن بھر پھولوں کی چنگیر سے اُس بازار کے تماش بینوں کے لیے موتیے، چنبیلی اور گلاب کے ہار پروتی تھیں، اُس گھر کا شاعر جا پہنچا کوٹھے پر......مگر کیسے؟''

''لو جی کہانی رُک گئی۔''

''نہیں۔ کہانی نہیں رُکی۔ وقفہ یا سانس لے رہی ہے۔ ہوا یہ کہ استاد بڑے غلام

علی خان جب آئے تو فن کے پرستار اُن کے گرد جمع ہوئے۔ وہ تو زیادہ دیر شہر میں رکنا بھی نہیں چاہتے تھے کہ پاکستان میں انہیں تو کوئی کے آصف بھی نہیں مل سکتا تھا جو ان کے قدموں میں سونا، چاندی ڈھیر کر کے کہے کہ فلم ''مغل اعظم'' میں ایک ٹھمری گا دو......تو اب استاد بڑے غلام علی خان کا قصد صرف وہ مغنیہ تھی جو صرف ایک الاپ پر کھڑی تھی۔ ارے بھئی کبھی کبھی کوئی فن کار صرف ایک الاپ پر بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔ چاہے وہ سائیں اختر حسین کیوں نہ ہو۔''

اب جیسے محفل کو سونپ سونگھ گیا ہو۔ ریستوران میں سناٹا سنسنا رہا تھا اور امام بخش پہلو بدل کے بولا ''تو ایسے میں وہ شاعر کہ عاشق مزاج تھا، استاد بڑے غلام علی خان کی صحبت میں بیٹھ کر اپنا اعتبار بنا کے اُس کے ہمراہ سیڑھیاں چڑھ کے اُس مغنیہ کے کوٹھے پر براجمان ہوا۔ اب استاد بڑے غلام علی خان کی دہشت سے وہ مغنیہ تو زہے نصیب سے آگے نہ بول سکیں۔ جب آس پاس کے کوٹھوں کو بھنک پڑی تو پل کے پل میں ایک بازار گرم ہو گیا۔ اب ایسے میں ہمارا شاعر بھی پیچھے پیچھے پہنچ گیا۔ وہاں موجود کسی باہر کے لونڈے نے پہچان کے کہا ''یہ تو پھول والی حویلی کا لڑکا ہے۔'' یہ سُننا تھا کہ ایک بھونچال آ گیا۔''

''اب ہمارے روبرو ہمارے پھولوں کے ہار بنانے والوں کا لڑکا بھی آ جائے گا۔''

''ہاں بھئی شعر کہتا ہے۔ آ گیا ہو گا ہماری صحبت میں۔''

''آپ کے حضور ٹھمری پیش کرنے کی جسارت تو نہیں کر سکتی مگر تخلیہ اگر مل جاتا تو باندی اس صحبت میں آپ کے قدموں پر کچھ نچھاور کرتی۔''

اب شاعر کے لیے سانس لینا مشکل تھا۔ استاد نے ایک نظر ڈالی۔ شاعر سیڑھیوں سے اُتر گیا۔ اُس دن کے بعد پھول والی حویلی سے کوئی گجرا، کوئی ہار، کوئی مالا باہر نہیں آیا۔ شاعر بھول گیا کہ مغنیہ کے کوٹھے سے کیسے نکلنا پڑا تھا۔ اب شاعر کسی کالج میں پڑھانے لگا

ناکام عشق اس کے مقدر میں تھے مگر وہ ہاتھ پھیلانے اور دل اُچھالنے میں مصروف رہتا تھا۔ ناکام عشق اس کے مقدر میں تھے مگر وہ ہاتھ پھیلانے اور دل اُچھالنے میں مصروف رہتا تھا کہ ایک دن اسے اُس مغنیہ کا پیغام ملا جو شاعری میں اصلاح چاہتی تھی۔ اب شاعر کو بیٹھے بٹھائے ایک موقع مل رہا تھا کہ اپنی شاعری کا سکّہ بھی چلائے اور اپنے ناکام معاشقوں کی راکھ سے کوئی نیا جہان پیدا کرے۔ اب جو شاعر اُس مغنیہ کے سامنے جا کر بیٹھا تو چاروں طبق روشن ہو گئے۔ سب کچھ اُس کے پاس تھا سوائے شاعری کی صلاحیت کے۔ ہمارے شاعر کے لیے تو میدان صاف تھا لیکن ایک اڑچن تھی اُس پر نظر رکھی جا رہی تھی۔ اس لیے کہ ان کوٹھوں پر کئی ضابطے اور طریقے ہوتے ہیں۔ اب سرنگ لگانی تھی اس حسینہ کے دل میں لیکن وہاں دل تو ہوتے نہیں محض چترائی ہوتی ہے لیکن دل کی جگہ کچھ ادائیں بھی ہوں تو عاشق کی خود فریبی کے لیے تو بہانہ چاہیے۔

''امام بخش اس شاعر کو ہم پہچانتے ہیں۔ اس کہانی سے آپ نے پردہ کیسے اٹھایا۔''

''پردہ ابھی اٹھے گا کہ پھول والی حویلی کا جو بھی قصہ تھا، گلی کے بیچ ہی دم توڑ گیا......اب جو شاعر نے دیکھا کہ اس حسینہ کو شاعری کیا، بات کرنے کا سلیقہ بھی ابھی سیکھنا ہوگا مگر شوق بہت تھا کہ کہیں اُس کو امراؤ جان ادا کے کردار کی بھنک پڑ گئی تھی۔ اپنے تئیں شاعرہ کہلوانا چاہتی تھی۔ ہمارے شاعر نے اُسے شیشے میں اور پھر دل میں اتارا۔ اس زمانے میں لڑکیوں کو لکھ کر شاعر بنانے کا چلن عام تھا۔ ہمارے شاعر کالجوں میں لڑکیوں کو زبردستی شاعرہ بنانے کے لیے ان کے والدین تک پہنچنے کا ہنر بھی جانتے تھے۔ ایسے میں کچھ غزلیں تو مغنیہ کی صورت پر لکھ کے نچھاور کی گئیں اور کچھ شاعرات کے لیے شاعر صاحب نے خصوصی تعلق استعمال کر کے لاہور سے رسالے منگوا کر پیش کیے مگر اُس مغنیہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا کہ وہ تو محض ایک ادا کا سہارا لے کر منتظر تھی۔ ایک ایسے معجزے کی جو اُسے شاعری کے بام پر ایسے بٹھا دے جیسے امراؤ جان ادا لکھنؤ میں مشاعروں کی زینت بن گئی تھیں۔''

''امام بخش تمہارا قصہ بے تاثیر ہو چکا ہے۔ہم جا سکتے ہیں؟''

''قصے کی تاثیر سننے والے میں ہوتی ہے۔وہ نہ رہے تو قصہ کیوں رہے گا؟''

''اچھا اب ہم تمہارے سامع ہونے کے بھی لائق نہیں رہے۔'' یہ بات منصور مہان نے کی تھی۔

''نہیں منصور مہان غور سے سننا سامع کہانی کا حصہ ہوتا ہے۔اب اگر وہ نہیں رہا تو یا قصہ گو کا قصور ہے یا سامع کا۔''

''یہی میں کہہ رہا ہوں تمہارا قصور ہے۔'' منصور بولا۔

''ارے یار جانی ذرا صبر تو لے لے۔قصہ تھوڑا روایتی ہے۔اس میں کوئی اندر کی طاقت نہیں ہے اور پھر آپ لوگ طوائفوں اور کنجریوں کے قصے سن سن کے دل کو ٹھنڈا کر چکے ہیں۔آپ کی اوقات نہیں رہی کہ ایسے قصوں سے خود کو وابستہ کر سکیں۔''

''لو جی اب امام بخش ہمیں قصے کے قابل ہی نہیں سمجھتا۔'' انقلابی بولا۔

''قصہ جب چل پڑتا ہے تو وہ اپنی مرضی سے رُکتا ہے۔آپ چاہتے ہیں قصے کے منہ میں لگام دے دیں۔جدھر چاہیں اپنی مرضی سے اُسے بگٹٹ دوڑائیں۔''

اس پر سب خاموش رہے۔بس اتنا کہا ''چلو تم قصے کا گھوڑا اب آگے بڑھاؤ۔''

''تو جناب والا! ہوا یہ کہ ہمارے شاعر نے ایک دن اندر ہی اندر گھلتے پگھلتے ہوئے اُس مغنیہ کے روبرو مطلع عرض کر ہی دیا۔''

''کیا تھا وہ مطلع؟'' بے تاب سامعین بلبلا اُٹھے۔

''وہ یہ تھا کہ اے حسن کی دیوی، میں اپنی جان اور دل آپ کے قدموں میں رکھ چکا ہوں۔بے تابی ایسی ہے کہ نہ دن کو دن نہ رات کو رات سمجھ پا رہا ہوں۔اپنا سایہ اپنا دشمن لگتا ہے۔دل سیڑھیاں چڑھتا ہے، اُترتا ہے۔ایک پل میں ہزار بار...... اگر تم نہ ملیں تو حادثہ ہو جائے گا۔کوئی نیچے بازار میں جان سے جائے گا۔''

اس پر وہ بولی ''تو یہ تو میرے بالا خانے کے لیے اچھا شگون ہے۔ والا و شیدا، عاشق و مہجور، تمنائی و شیدائی، چشم کُشا اور دل کُشا، تابِ نظارہ کا منتظر...... دردِ لا دوا کا مریض وغیرہ وغیرہ...... یہ سب لوگ نیچے جمع ہو کر میرے بالا خانے کی طرف دیکھا کریں گے۔''

''لیکن کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔'' ہمارے شاعر صاحب نے پینترا بدلا......

''اب آپ نے ہماری شاعری کی اصلاح میں یہ سب ادائیں اور باتیں اگر ہمیں بتائی ہیں تو ہم تو وہ آپ کے روبرو لائیں گے۔''

اب ہمارے شاعر صاحب کے پاس کوئی بچاؤ کی صورت نہ رہی تو بولے ''بس ہم آپ کے حسن کے غلام ہو چکے۔ چاہو تو دیوار میں چُن دو چاہو تو نگاہِ تیر انداز میں پرو دو۔''

اس پر وہ پری زاد کہ دماغ کی کُشادہ تھی، بھانپ چکی تھی کہ کسی ریاست کا نواب یا کم سے کم کسی زمینوں کا جاگیردار نہیں ہے۔ محض لفظوں کا سکّہ چلا کے اپنا کھوٹا سکّہ چالو کرنا چاہتا ہے تو اُس نے سوال ڈال دیا:

''کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟''

اب ہمارے شاعر صاحب کو پسینہ آ گیا۔ ذرا سنبھلے اور بولے ''کیوں نہیں، آپ کا حکم ہو تو ہم ابھی کے ابھی شادی کر سکتے ہیں۔''

''تو کیا تم مجھے پھول والوں کی حویلی میں لے جاؤ گے جہاں ہمارے چاہنے والوں کے لیے گجرے بنتے ہیں۔''

اب یہ سننا تھا کہ شاعر صاحب کا ماتھا ٹھنکا اور اُن کا پسینہ پاجامے سے بہہ نکلا۔ اب یہ پسینہ تھا یا کچھ اور فی الحال یہ بتانا مشکل ہے۔

''تو پھر یہ سب کیسے پتہ چلے گا۔'' کسی نے پوچھا۔

''کچھ پتہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ مکالمہ آگے بڑھے گا۔ اُس مغنیہ اور حسینہ

نے اگلا وار کیا کہ اگر گھر نہیں تو کسی محل، کسی بنگلے کسی کوٹھی میں لے جاؤ کہ اس شہر میں تو بے شمار نواب، جاگیردار، زمیندار اور راجے مہاراجے کسی نہ کسی شکل میں رہتے ہیں۔''

اب ہمارے شاعر کی پوری جمع پونجی خرچ ہو چکی تھی کہ ایسے میں اُس مغنیہ پر نظر رکھنے والی نے اوٹ سے شست لگائی۔ جب ہمارے شاعر صاحب نے اپنا آخری پتا پھینکا کہ ہم یہاں سے بھاگ جاتے ہیں تو اُس حسینہ نے کہا ''کہاں بھاگیں گے۔ کیا تم نے میرے لیے کوئی بنگلہ، کوئی ریسٹ ہاؤس، کوئی بڑا ہوٹل، کوئی ملک سے باہر لے جانے کا بندوبست کر رکھا ہے......''

''محبت کی اپنی زمین ہوتی ہے۔ اپنا آسمان ہوتا ہے۔ محبت کا سائبان ہر طرح کے موسموں کو برداشت کر سکتا ہے۔ اگر تم مجھے چاہتی ہو تو ہم یہاں سے بھاگ جائیں گے اور پھر لاہور یا کراچی میں میری اور تمہاری شاعری گونجے گی۔ تم دنیا میں مشہور ہو چکی ہو گی اور اس ذلت کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاؤ گی۔''

ابھی یہ بات مکمل ہوئی تھی کہ مغنیہ پر نگاہ رکھنے والی سالخوردہ، موسم چشیدہ اور گھاگ قسم کی مالزادی سامنے آ گئی اور اس نے سیدھا وار کیا۔

''اوئے ساحر لدھیانوی کے پلّے۔ اوئے جوش ملیح آبادی کے ملیدے اور فیض کے فُضلے۔ نکل ادھر سے۔ کہاں کے نواب، کہاں کے راجے، کہاں کے گدی نشین، کہاں کے نواب زادے۔ پھول والی حویلی کے ماشٹر نکلو ادھر سے نہیں تو اِدھر ہی پتلون شلوار اُتار کر ہاتھ میں پکڑا دوں گی...... اب جو شاعر صاحب نے تیور دیکھے تو سیڑھیوں کا راستہ ڈھونڈتے ہوئے کئی دیواروں سے سر ٹکرایا...... اور پھر معلوم نہیں کب تک کسی محفل میں آئے یا نہ آئے۔''

''لو جی کہانی تمام ہوئی۔''

''ہاں تمام ہوئی......''

''کہانی کا سبق کیا نکلا؟''

''پاجامہ دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ...... یا اوقات گلی کی سوغات پھلی کی۔''

''مطلب؟''

''سوغات پُھل والی......''

اب امام بخش نے تاریخ کا ایک ورق پلٹ دیا تھا اور سب سننے والے چونکہ جانتے تھے کہ شاعر کون تھا تو سب نے تاسف کیا کہ اتنا وقت اس کہانی پہ کیوں صرف کیا...... کبھی کبھی قصہ گو بھی اپنا اسیر ہو جاتا ہے۔ اسے تو قصے کا پالن نبھانا ہوتا ہے۔ سو امام بخش نے نبھایا۔ اب امام بخش کو دوسرے ریستوران بھی جانا تھا۔ وہ اٹھا اور بولا ''دوستو کہانی میں سبق نہیں ہوتا۔ کہانی خود سبق ہوتی ہے۔''

بہت دیر تک سناٹا رہا۔ بہت دیر تک سب بیٹھے رہے۔ کسی نے کوئی بات نہ کی۔ نہ کسی نے کسی کو دیکھا۔ جیسے سب ایک دوسرے سے نظریں چُرا رہے ہوں اور جانتے ہوں کہ شاعر کے ساتھ شہر والوں نے کیا کیا ہے؟

کہ اچانک امام بخش پلٹا اور بولا۔ ایک عجب قصہ ابھی بھی میرے دھیان میں ہے۔ یہ حیدر آباد دکن کا قصہ ہے۔ اب حیدر آباد دکن کدھر سے آ گیا۔ کوئی بولا۔

''بھئی قصہ ہے اُس سے قصہ تو جڑا ہوگا کہ نہیں۔ تو سنو قصے نے قصے کو جنم دیا ہے۔''

اب سننے کے سوا چارہ نہ تھا۔ امام بخش سب کو حیدر آباد دکن لے گیا۔ یہ قطب شاہی دور تھا۔ اور زمانہ قلی قطب شاہ کا تھا کہ شاعرِ بے بدل اور عالمِ باکمال تھا۔ گولکنڈہ قلعے میں شعر و موسیقی کے ساتھ علم و عرفان کی محفلیں ایسی سرگرمی سے جاری رہتی تھیں کہ دلّی سے لکھنؤ سے پنجاب سے اور بنگال تک سے شاعر و ہمہ دان نکتہ دان جمع ہوتے تھے۔ بلائے جاتے تھے۔ قلی قطب شاہ کو ایک دن ایک ماہرِ موسیقی کہ دربار سے وابستہ تھا اور اطراف کی

خبر رکھتا تھا۔ پورے دکن میں فن اور فنکاروں کے کھوج میں اپنا مقام رکھتا تھا۔ دست بستہ گوش گزار ہوا کہ حضرت آپ کی شاہی کی ناک کے نیچے دو ناک نقشے والی چندے آفتاب چندے ماہتاب دو بہنیں موسیقی اور گائیکی کا چراغ جلائے ہر شام چند کوس دور ایک پہاڑی پر براجمان ہو کر گولکنڈہ قلعے کی طرف رُخ کر کے گاتی اور ساز بجاتی ہیں۔ اب قلی قطب شاہ کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ کہاں کا قُلی کہاں کا قطب کہ اُسے پتہ ہی نہیں اُس کی سلطنت میں فن کی شمعیں پہاڑیوں پر جل رہی ہیں۔

"امام بخش بہت ہو گئی۔ ان دو بہنوں کا ذکر تاریخ میں ہے۔"

یہ منصور مہان تھا جو بولا۔

"ہاں اب تو تاریخ کی کسی غلام گردش میں یہ نام ہے۔ مگر اُس وقت نہیں تھا اب سنو۔ ان دو بہنوں کے نام تھے۔ تارہ متی اور پریما متی۔ تارہ متی گاتی تھی اور پریما متی ستار بجاتی تھی۔ دونوں شام ڈھلتے ہی اُس پہاڑی پر کہ خاصی اونچی تھی، آ جاتی تھیں اور پھر دونوں مگن ہو کر صرف اپنے لیے گاتی تھیں۔ آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ فطرت کا مکمل سناٹا ہوتا تھا۔ صرف ہوا اُن کے ساتھ شریکِ محفل ہوتی تھی۔ دور کوئی کوئی چراغ ٹمٹماتا ہوا دکھائی دے جاتا تھا یا قلعہ گولکنڈہ کی مشعلیں اپنا جلوہ دکھا رہی ہوتی تھیں۔ باقی جو تھا آسمان کی کہکشاں اور ستاروں کی مجلس ہوتی تھی جو اُن کو سنتی تھی، اب جو قلی قطب شاہ نے سُنا تو سُن رہ گیا۔ اپنے دربار کے بزرگوں سے مشورہ کیا اور اپنی علم پرستی اور فن دوستی کا حوالہ دیا اور پھر مشاورت سے اُن دو بہنوں کو پیغام بھیجا کہ قطب شاہی دربار میں آ کر ملاقات کریں اور ہو سکے تو اپنے فن کی شناخت قطب شاہی دربار سے کریں۔ جب اُن بہنوں کے پاس قطب شاہی فرمان پہنچا تو ان بہنوں نے مسکرا کر ایلچی کو لوٹا دیا کہ ہم اور ہمارا فن کسی دربار کے لیے نہیں ہے۔ ہم اپنے لیے گاتی ہیں اور اپنے لیے ساز بجاتی ہیں۔

اب قلی قطب شاہ کہ شاعرِ بے بدل تھا۔ دل بہت نازک تھا کسی بھی طرح سے کسی

کا دل دُکھانا اُس کی سرشست میں نہیں تھا۔ سوچ میں پڑ گیا اور پھر درباریوں نے طرح طرح کے مشورے دیئے کہ اُن کی یہ مجال جو حضور کے روبرو گستاخی کریں۔ حکم دیں تو اُن کو حاضر کریں اور پھر وہ ہیں کون۔ آخر تو وہ اسی حیدر آباد دکن کی پیدائش ہیں۔ اس پر قلی قطب شاہ نے توقف کیا اور اُن دو بہنوں کی عزت اور شان میں فرمان جاری کیا۔ کہ یہ دونوں بہنیں تارا متی اور پریما متی ہماری عزت ہیں۔ ان کی وجہ سے شاید تاریخ مجھے اچھے نام سے یاد کرے گی۔ شاید میری شاعری کسی کے دھیان میں نہ رہے۔ مگر یہ واقعہ تاریخ میں گونجے گا۔ سنو میرے دوستو۔ میں امام بخش گواہی دے رہا ہوں کہ قلی قطب شاہ کی شاعری اپنی جگہ مگر یہ واقعہ قلی قطب شاہ کو تھامے ہوئے ہے۔ مگر واقعہ ختم نہیں ہوا۔"

"اب پھر نیا چکر ڈال دیا امام بخش نے۔" کوئی چیخا۔

"نہیں بے حوصلہ نہ ہو۔ کہانی تاریخ کے ابواب میں سے برآمد ہوئی ہے۔ اس لیے اس کا انت بھی ہے۔ اب یہ ہوا کہ قلی قطب شاہ بے چین رہنے لگا۔ بے کلی سی اُس پر شام کے وقت چھائی رہتی تھی۔ وہ کوئی عاشق مزاج نہیں تھا۔ تجسّس مزاج ضرور تھا کہ آخر یہ دو بہنیں کون ہیں۔ کیا چاہتی ہیں۔ کوئی اُسے یہ بھید نہ دے سکا تو آخر اُس نے خود ہی فیصلہ کیا کہ گولکنڈہ کی اونچی پہاڑی پر شام کے وقت بیٹھ جاتا تھا اور ہوا کے رُخ کو پہچانتا تھا کہ جس پہاڑی پر وہ دونوں بہنیں بیٹھ کر گاتی بجاتی ہیں۔ ان کی آوازوں کو ہوا کیسے گولکنڈہ قلعے تک لا سکتی ہے۔ اب یہ بھید کُھل گیا کہ ہوا نے سب ثابت کر دیا۔ اب قلی قطب شاہ ہوا کو دیکھتا اور اُسی رُخ پر بیٹھ جاتا۔ اُسے اُن کی آوازیں ہوا کے دوش پر آ کے ملتی تھیں۔ اُن کی صورتیں تو دکھائی نہ دیتی تھیں مگر آوازیں برابر اُس سے معانقہ کر لیتی تھیں۔ یہ معمول رہا جب تک سننے والا اور سنانے والیاں حیات رہیں۔ پھر مورخ لکھتا ہے کہ قطب شاہی خاندان کا ایک گورستان ہے۔ جس میں صرف خاندان کے افراد ہی دفن ہو سکتے ہیں۔ اس پر علامہ اقبال کو جب حضرت نظام دکن نے بلایا تو واپسی پر انہوں نے نظم لکھی "گورستان

شاہی''۔یہ نظم ''بانگِ درا'' میں موجود ہے۔قلی قطب شاہ نے حکم دیا کہ جب یہ دونوں بہنیں دنیا سے رخصت ہوں گی تو ان کے جسدِ خاکی کو اس قبرستان میں جگہ ملے گی اور وہ دونوں وہاں دفن ہیں۔

باب دوم

شہر کا موسم بدلا۔ چیت کے آتے ہی شہر کی پھلواڑیاں مہکنے لگتیں۔ صبح دم ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ ہر طرح کے پرندے اِدھر اُدھر سے اُڈ آتے اور قدیم ایام کے بنائے گئے پارکوں اور باغ بغوچیوں کے گرد لگے درختوں پر ڈیرہ ڈال دیتے۔ اُن کی سینکڑوں قسموں کا حساب صرف علامہ امام بخش ہی رکھتا تھا اور وہ اپنی معلومات سے سب کو ششدر کر دیتا۔ آبی پرندوں، صحرائی پرندوں، چراگاہوں کے پرندوں سے لے کر سخت موسموں کی مار کھانے والے تقریباً سبھی کم یاب اور نایاب پرندوں کا اُس کے پاس پورا ماحولیاتی تجزیہ اور نظام موجود تھا۔ ایک خرابی اس علاقے میں تھی کہ نواب، جاگیردار، زمیندار اور اُن کے گماشتے پرندوں کے دشمن تھے۔ قدرتی طور پر یہ علاقہ تیتروں، تلوروں، تلیئروں اور بٹیروں کے لیے دنیا کا خوبصورت ترین علاقہ تھا۔ اس مقصد کے لیے ہر دو نمبر شہری ایک آدھ شاٹ گن، ایک نالی یا دو نالی بندوق گھر میں ضرور رکھتا تھا۔ غلیل باز اور گھٹیا شکاری اپنے کرتبوں اور کرتوتوں کے ساتھ الگ سے موجود تھے۔ کوئی جال بچھانے کا کاریگر، کوئی ہوا کے رُخ پر کپڑے کی چادر کھڑی کرنے کا جغادری تھا کہ جو بٹیر اور تیتر اُڑ کر آئے فوراً ہی پھنس کر گر جائے۔ یوں نام کو اس علاقے میں بھی ''گیم وارڈن''، یعنی شکار کو چیک کرنے والا محکمہ موجود تھا لیکن اُسے معصوم پرندوں کی بجائے امراء اور بااثر لوگوں کے دستر خوانوں کی عزت اور

عظمت کو بڑھانے کی قیمت ملتی تھی، اس لیے وہ پرندوں کے بے دریغ قتل عام پر خاموش رہتا تھا۔

علامہ امام بخش بٹیروں کی نسل کُشی کے خلاف تھا۔ بٹیر ہزاروں میل کا سفر کر کے سنٹرل ایشیا سے آتا تھا اور یہاں آ کر گر جاتا تھا اور پھر مکار شکاری بڑے بڑے ٹوکروں میں ننھی جانوں کو ڈال کر اوپر جالی لگا کر امیر شہروں کی طرف روانہ ہوتے۔ اکثر ان کا دم گھٹ جاتا تو وہ سفر کی تاب نہ لا کر ہمارے گناہوں میں کمی کا باعث بن جاتے۔ علامہ امام بخش عجیب طرز کا آدمی تھا۔ معصوم پرندوں کے حق میں ریسرچ کے خزانے لُٹا دیتا تھا لیکن ان معصوم پرندوں کا سب سے بڑا باورچی بھی وہ خود تھا۔ تیتر، تلور، تلیئر اور بٹیر پکانے میں اس کا ثانی نہیں تھا۔ پچھلے جنم میں وہ والیانِ ریاست کا شاہی مطبخ رہا ہوگا۔ بٹیر پکانے کا نسخہ اگر وہ کسی کو بتا دیتا یا بُھنے دیسی مُرغ کی ترکیب بتا دیتا تو وہ آدمی سات پشتوں تک کھرب پتی ہوسکتا تھا۔

اب ایسا ہوا کہ اس طرح کے موسم میں علامہ اچانک غائب ہو گیا۔ چائے خانوں، قہوہ خانوں، ریستورانوں اور شہر کے تہذیبی مراکز میں علامہ کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی۔ ایسا کم ہی ہوا تھا کہ وہ ایک یا دو دن غیر حاضر رہتے۔ خیر اُن کے گھر پر تالا پڑا تھا...... سب یہ سوچنے لگے کہ وہ کسی نہ کسی کہانی کی تلاش میں گئے ہیں۔ کسی نے کہانی اُڑائی کہ اُسے کسی سخت گیر جاگیردار نے بہانے سے طلب کیا اور پھر اپنی حویلی کی غلام گردش میں زندہ دفن کر دیا۔ اُس کا جرم یہ بتایا گیا کہ اُس نے ان کے خاندان کی ایک لڑکی کا قصہ قہوہ خانوں اور امراء کے دیوان خانوں میں مکمل مہارت اور قصہ گوئی کی جزئیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیان کر دیا تھا جو ایک چوڑیاں پہنانے والے سیلز مین کو اپنا ہاتھ دے آئی تھی۔ ہاتھ کی کلائی میں چوڑی کیا آئی، گویا مُٹھی میں دل آ گیا۔ شاید کوئی چاندرات تھی۔ جب یہ پردہ لگی گاڑی میں بیٹھ کر چوڑیاں پہننے اپنی دایہ کے ساتھ آئی تھی۔ چوڑیاں پہنانے والا سیلز مین

انگلیوں سے کلائی تک کا سفر دل سے دل تک میں طے کر گیا۔ اگلے دن حویلی میں ڈھونڈیا پڑی۔ کنیزیں، دائیاں، نوکر چاکر خوب دوڑے، کچھ پتہ نہ چلا۔ زمین کھا گئی یا آسمان......
بالآخر زمین نے ہی اُسے کھانا تھا۔ سو وہ پکڑی گئی۔ سیلز مین کی کیا اوقات تھی، کہاں لے کر بھاگتا۔ اپنے گاؤں میں پکڑا گیا۔ دونوں کو حویلی کی غلام گردش میں دفن کر دیا گیا۔ یہ قصہ امام بخش کی زبان پر آیا اور چند روز چلا۔ اب شُبہ یہ تھا کہ اُسی غلام گردش میں امام بخش کو بھی زمین کھا گئی لیکن اس قصے کے علاوہ بھی امام بخش کی گم شُدگی کے کچھ اور قصے مشہور ہوئے۔
کسی نے بتایا کہ امام بخش کسی نایاب جڑی بوٹی کی تلاش میں کوہ قاف یا دشوار گزار پہاڑوں میں کہیں نکل گیا ہے۔ یہ جڑی بوٹی تاریخ کی کتابوں میں اُمراء کے لیے جوانی واپس لانے کے لیے بنائی جانے والی معجون میں کام آتی تھی۔ اس شہر کے جملہ امرا اپنی جوانی کی کامیاب واپسی کے لیے کچھ بھی دینے کو تیار ہوتے۔ اس لیے شہر میں قریب قریب سینکڑوں حکیموں اور حاذق حکماء کے شفا خانے اور دیسی نسخوں کے ماہرین کی دکانیں موجود تھیں۔ عام طور پر یہ معجونیں، ادویات اور کشتے یہ امراء اپنی بیویوں پر نہیں اپنی رکھیلوں پر آزماتے تھے جنہیں وہ اپنی خاندانی حویلیوں میں نہیں رکھتے تھے بلکہ گلی محلوں میں کرائے کے مکانوں میں رکھتے تھے۔ جہاں رکھیلیں اپنے عاشقوں کو بھی بھگتا لیتی تھیں۔ یہ عجب طرح کی آنکھ مچولیوں کے کھیل تھے جسے امام بخش اچھی طرح جانتا تھا۔ اس لیے سنا ہے کہ وہ اُس جڑی بوٹی کی پہچان رکھنے کی وجہ سے پہاڑوں کی طرف نکل گیا ہے۔
کسی اور نے یہ کہانی ڈالی کہ امام بخش کو سندھ کے کسی بہت علمی گھرانے کے وڈیرے نے کہانیاں سنانے کے لیے دعوت دی ہے اور وہ ان کی دعوت پر وہاں چلا گیا ہے۔ امام بخش کی شہرت میلوں تک پھیلی ہوئی تھی اور سندھ کے وڈیروں اور دوسرے علاقوں کے وڈیروں میں بس یہی فرق تھا کہ سندھی وڈیرے علم وفن کی سرپرستی میں قصہ گو کو بھی اہمیت دیتے تھے۔ اس کہانی کو پذیرائی ملی اور قہوہ خانوں میں امام بخش کا ذکر چلتا رہا۔

کسی اور نے ایک شام الگ سے ایک قصہ سنا دیا کہ حضور امام بخش کہیں نہیں گیا، وہ کسی کے عشق میں فقیر ہو گیا ہے اور فقیری چولا پہن کے کسی درگاہ پر بیٹھ گیا ہے۔ امام بخش جو قصوں کی جُگالی کیا کرتا تھا، خود قصہ بن جائے گا یہ کسی کے گمان میں نہیں تھا۔ ان چاروں قیاس آرائیوں کا کوئی واضح ثبوت کوئی فراہم نہ کر سکا۔ قصہ کوتاہ امام بخش کی کمی محسوس ہوتی رہی اور جن کہانیوں کو اُس نے پیدا کیا تھا، چائے خانوں میں اُن کی جزئیات پر غور و خوض ہوتا رہا۔ ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ اُس کے سامعین میں قصہ گوئی کے اسرار و رموز نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ آخر کو سامع بھی ایک دن اپنے قصہ گو کی جگہ لے لیا کرتا ہے تو ہوا یوں کہ ہر چائے خانے اور ریستوران میں امام بخش کی جگہ کوئی نہ کوئی براجمان ٹھہرا اور لگا اپنی لکنت زدہ داستان گوئی کے اعجاز کا مظاہرہ کرنے۔ یوں شہر میں کئی قصہ گو پیدا ہو گئے۔ بھلے یہ امام بخش کی غیر موجودگی کا سبب تھا یا فطری ذہانت کا شاخسانہ تھا۔ اندازہ لگانے والوں کے لیے ایک الگ کھیل ہاتھ لگ گیا لیکن جلد ہی یہ معمہ حل ہو گیا کہ امام بخش کے ساتھ کیا ہوا ہے۔

وہ ایسے کہ اخباروں اور پرچہ نویسوں نے خبر لگا دی کہ صحرائے چولستان میں ایک شکار پارٹی راستہ بھول جانے کے باعث کئی دنوں تک راستہ تلاش کرنے میں لگی رہی۔ بالآخر اس کے تمام لوگ پیاس اور بھوک کی وجہ سے دم توڑ گئے۔ صرف ایک کو بچایا جا سکا جس کا نام امام بخش ہے۔ اب تو جیسے شہر کے چائے خانوں اور قہوہ خانوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی کہ امام بخش کو زندہ بچایا جا سکے تا کہ وہ اپنے پر گزری کہانی خود سنا سکے۔

ایسے میں دن رات شہر کے ادیب، حکیم، شاعر، وکیل، استاد اور طالب علم ہسپتال کے چکر کاٹنے لگے۔ جلد ہی امام بخش نے ہوش سنبھالی اور واپس سب میں آ کر بیٹھ گیا۔ اب ہر قہوہ خانے اور ریستوران کی خواہش تھی کہ وہ منہ کھولے اور اپنی روداد سنائے مگر اُسے تو چپ لگ گئی تھی۔ اس کے اندر قصہ دم توڑ چکا تھا۔ اس کی روح میں قصہ گوئی کا فن دفن ہو گیا

وہ جانے کس تجربے سے گزرا تھا کہ وہ کچھ بھی سنانے پر تیار نہیں تھا۔ شہر کا قصہ گو، سحرالبیان کا موجد اور طوطیٔ زمان اچانک خاموش ہو گیا۔

کہیں بھی بیٹھتا تو جلدی پہلو بدلنے لگتا۔ پرانے دوستوں نے اُس کا دل لگانے کی کوشش کی کہ پھر سے اُس کے اندر کہانی کا چشمہ بہنے لگے اور رُکی ہوئی کہانی کہیں سے بہہ نکلے۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ چولستانی کھوجی جو راستوں کی تلاش کا ماہر تھا اور جو پاؤں کے نشانوں سے سمت کا اندازہ لگا سکتا تھا مگر صحرا میں پاؤں کے نشان نہیں رہتے۔ وہ سمتوں اور ہواؤں کا رازدان بھی تھا۔ اُس کا چہرہ سورج کی تمازت سے سوکھے چمڑے میں بدل چکا تھا اور رنگت میں پرانے تانبے جیسا تھا۔ وہ قہوہ خانے میں داخل ہو کر سیدھا امام بخش کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا جیسے ہزار سال کی قید تنہائی سے آزاد کوئی اچانک سامنے آ کر دیکھنے لگتا ہے۔ ایسے اُس نے دیکھا۔ علامہ امام بخش اُسے دیکھ کر پتھر ہو گیا۔ ایک پتھر کے سامنے دوسرا پتھر...... عجب نظارہ تھا۔ قہوہ خانے میں بیٹھے شاعر، صحافی اور پیشہ ور انقلابی دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ امام بخش اٹھا اور اُس کو گلے لگا کر رونے لگا۔ بہت رویا اور پھر جی ہلکا کر کے بیٹھ گیا۔ وہ اجنبی اُسے دیکھتا رہ گیا اور پھر اُس نے اپنی چولستانی دانش کو استعمال کیا کہ آخر اُس کے پُرکھوں اور آباؤ اجداد کے سامنے دریائے ہاکڑا یا سرسوتی خشک ہوا تھا اور جب خشک ہوا تھا تو پرندوں نے بھی گواہی دی تھی اور ایک بزرگ نے خشکی کے اشارے کا طبل بجا دیا تھا اور پھر دریائے ہاکڑا خشک ہو گیا۔ علاقہ صحرا بنا اور قصہ گو کے ہاتھ میں صرف ریت آئی مگر ایسا بھی نہیں ہے۔ امام بخش دریائے سرسوتی اور پھر ہاکڑا کے خشک ہونے کی ساری کہانی کا گواہ تھا اور اُس نے دریا کے خشک بستر سے ہمیشہ سیپیاں تلاش کی تھیں اور شاید وہی دریا اُسے چولستان کھینچ کر لے گیا تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دریا کے گرد رہنے والوں کی ثقافت اور زندگی جب روٹھ جاتی ہے تو قافلہ در قافلہ وہ لوگ نقل مکانی کر لیتے ہیں مگر جو اپنی زمین اپنے جھونپڑے نہیں چھوڑتے، امتحان تو اُن کا ہوتا ہے جو وفا نبھاتے ہوئے پیاسے رہ

جاتے ہیں، وہ مرتے نہیں ہیں۔ مر مر کے جیتے ہیں اور اس وقت چولستان میں جو آبادیاں ہیں، انہوں نے بہت کڑے امتحان برداشت کرتے ہوئے چولستان کے صحرا کی نگہبانی کی ہے۔ کیا کوئی ناول نگار جو اُن کی تاریخ پر ہاتھ صاف کرتا ہے، کیا ایک رات اُن کے دُکھ سہہ سکتا ہے۔ کیا ان کے دن کے سفر کا بوجھ اٹھا سکتا ہے۔ امام بخش سوچ رہا تھا کہ ہم ادیب، مورخ اور ناول نگار کتنے خودغرض، بے بس اور لالچی ہوتے ہیں۔ دریا سوکھنے کے عمل کو مزے لے لے کر لکھتے ہیں۔ داد سمیٹتے ہیں اور پھر کبھی نہیں سوچتے کہ جو وہاں رہ گئے ہیں اب وہ کس حال میں ہیں مگر امام بخش اُن میں سے نہیں تھا۔ وہ تو چولستان کے رہنے والوں کی خبر لینے اکثر جاتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ ہر سال وہ چنن پیر کے میلے میں جا کر بسرام کرتا تھا۔ رات کے سمے تاروں بھرے آسمان کے نیچے بیٹھ کر چاروں کھونٹ دیکھتا اور سوچتا کہ راستہ بھولنا کتنا دلچسپ عمل ہوگا اور وہ اکثر راستہ بھولنے کے خواب دیکھنے لگتا۔ وہ دیکھتا کہ وہ صحرا میں راستہ بھول گیا ہے اور اچانک ایک غار دکھائی دی ہے اور وہ اس میں داخل ہو کر کسی اور ہی صدی میں داخل ہو گیا ہے۔ اس طرح امام بخش خواب میں چولستان میں کبھی دریا کی روانی دیکھتا، کبھی آندھیاں چلتے دیکھتا۔ کبھی صحرا پر بارش برستے دیکھتے جو دریا کے سوکھنے کا کفارہ ہوتا مگر امام بخش چولستان کا ہمدرد تھا اور جانتا تھا کہ جب چولستان پر بارش برستی ہے تو وہاں پیلوں کی جھاڑیوں پر بہار آتی ہے۔ دنیا میں کوئی نہیں جانتا کہ چولستان کا یہ پھل کیا ہوتا ہے اور شاید کوئی جان بھی نہ سکے کہ یہ پھل ایک میل سے آگے سفر نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے کتنے پھل پیدا کیے ہوں گے جو دور تک نہیں جا سکتے۔ ہاں امام بخش جانتا تھا کہ ایک کھجور چولستان سے ذرا فاصلے پر ہوتی ہے جسے مقامی زبان میں ڈینڈا کہتے ہیں، وہ کھجور کے درخت پر پکتی ہے اور اس میں جو شیرہ ہوتا ہے، وہ ٹپکتا ہے۔ اب اس کھجور کی زندگی زیادہ نہیں ہوتی۔ اُسے اتار کر کھالیں یا پھر گھر تک لے جائیں اور کھالیں۔ جونہی اسے دھوپ یا ہوا لگے گی، وہ کھٹی ہو جائے گی۔ اس کا مطلب ہے اس طرح کی کھجور کا ذائقہ دور تک نہیں جا

سکا۔اسی طرح خوبانی اور آلو بخارہ کی ایک قسم ایسی ہے کہ وہ بس درخت سے اترتی ہے اور لوگوں کے پیٹ میں جا کر بسرام کرتی ہے۔

اب اگر سوچیں تو اللہ نے ایسے کتنے پھل پیدا کیے ہیں جو کسی کسی کی قسمت میں لکھے ہیں تو اپنے رب کا شکر ادا کرو کہ جس نے تمہارے واسطے پھل، پھول اور سبزیاں پیدا کی ہیں۔امام بخش نے ایک لمحے کو سوچا کہ وہ جس سفر پر روانہ ہوا تھا، اُس میں اُس کے لیے کیا کشش تھی۔وہ جس چولستانی اجنبی سے مل کر رویا، وہ وہی تھا جس نے جاں بلب امام بخش کو صحرا میں تلاش کیا اور اپنی مشکیزہ سے اس کے ہونٹوں پر پانی ٹپکایا۔اگر ذرا سی بھی تاخیر ہو جاتی تو گواہی دینے کے لیے کوئی باقی نہ بچتا۔اب اس سانحے کا واحد گواہ امام بخش موجود تھا۔ امام بخش جانتا تھا کہ چولستان میں خواجہ غلام فرید نے اپنی شاعری میں کن کن پودوں، جھاڑیوں، پھلوں، پھولوں اور درختوں کا ذکر کیا ہے اور وہ کیسے ہاکڑا دریا خشک ہونے کے بعد بھی اپنی جڑیں کہیں نیچے کسی طرح کی نمی سے رشتہ جوڑے ہوئے تھے۔امام بخش ان سب کے نام اور شجرہ نسب کو جانتا تھا۔جنڈ، جال، کریر، پیلو سے لے کر کنڈیر تک سینکڑوں پودے، درخت اور جھاڑ امام بخش کے دوست تھے مگر وہ وہاں اب کے کیوں گیا۔اس بار وہ پہلی بار قصہ گو کے طور پر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے قہوہ خانے میں بولا کہ وہ چولستان میں کس کس کے ساتھ گیا اور اُن سب کے ساتھ کیا ہوا۔

موسم بس بہار اور گرمیوں کی دہلیز پر کھڑا تھا۔اب بھلا چولستان کی بہار کیا ہو گی۔ بس یوں کہ پورے میں ہریالی پھیلی تھی۔رات کو بارش اچانک برس گئی تو صبح کی ہوا میں عطر گھل گیا۔سورج کچھ شرمایا، کچھ رات کی بارش کی کوکھ سے نکلا تو اپنی عزت کا پاس اُسے بھی تھا۔وہاں کی بہار اور گرمی کے موسم میں بس ایک سرگوشی کا فاصلہ ہوتا ہے۔ایک قدم کی چاپ ہوتی ہے۔ایک ہوا کی سرسراہٹ ہوتی ہے۔اس لیے اچانک نواب حلیم خان کے جی میں آئی کہ لینڈ روور نکالو۔جیپیں تیار کرو اور امام بخش کو طلب کرو کہ ایک قصہ گو کا ہم سفر ہونا

ضروری ہے۔ اب امام بخش نے سوچا کہ ہمراہی میں نواب حلیم خان تو ہے مگر کوئی ہم ذوق بھی تو چاہیے تھا۔ سو اُس وقت دو ہم سفر اور مل گئے۔ ایک تو صدا کا سیلانی منصور مہان، جن کا نام مہان ایسے نہیں پڑا تھا، وہ ہر لحاظ سے مہان تھے۔ جیب کے ڈھیلے، دل کے کُھلے، دماغ کے چوکنے، محفل کے رسیا، جی میں آئی کہ عالم لوہار نے میاں چنوں میں میلے میں اپنا چمٹا کھنکھنایا ہے تو گاڑی نکالی اور جا پہنچے۔ عالم لوہار نے اس میلے میں کیا کمایا ہوگا۔ بس ایک چھوٹا سا خیمہ تانا ہوا تھا اور اس میں خود ہی ٹکٹ بیچتے اور پھر خود ہی شو کرتے تھے۔ وہ تاروں کی چھاؤں میں چارپائی پر لیٹے اگلے دن کے شو کا سوچ رہے تھے کہ منصور مہان نے گاڑی روکی اور عین اُن کے سر پر جا کر آواز دی کہ چمٹے والی سرکار ہم آئے ہیں۔ عالم لوہار ویسے بھی کروٹیں بدل رہا تھا۔ اُٹھ بیٹھا اور پھر دیکھا کہ تین نوجوان کھڑے ہیں اور بضد ہیں کہ عالم لوہار تھیٹر میں اپنا فن دان کرے۔ عالم لوہار جس کاسٹیوم میں شو کرتا تھا، وہ چمکدار کُرتا جس پر سونے چاندی کے مصنوعی تاروں سے کڑھائی کی گئی ہوتی تھی اور وہ تہبند بھی اُسی رنگ کا پہنتے تھے۔ کپڑا ابھی وہی ہوتا تھا مگر تہبند کو بیلٹ باندھی ہوتی تھی کہ پرفارمنس کے دوران تہبند گر نہ جائے۔ اب منصور مہان اپنے دوستوں کے ساتھ لکڑی کے بنے بنچ پر بیٹھ گیا اور چمٹے والی سرکار نے پرفارمنس دی۔ یہ میاں چنوں کا واقعہ ہے جو امام بخش کو معلوم تھا۔ عالم لوہار نے جگنی گا گا کر صبح کر دی اور منصور مہان خاموشی سے عالم لوہار کی چارپائی کے تکیے کے نیچے کچھ پیسے رکھ کر گاڑی میں بیٹھا اور روانہ ہو گیا۔ اب حلیم خان کے قافلے میں منصور مہان کے علاوہ امام بخش نے فیض بخش تونسوی کو بھی طلب کر لیا کہ تونسہ کے لوگ لمبی راتوں اور لمبے سفر میں بہت خوش رہتے بھی ہیں اور دوسروں کو خوش بھی رکھتے ہیں۔ یہ شام سے رات ہونے کا عمل تھا، حلیم خان نے جیپیں نکالیں اور پھر یہ قافلہ چولستان کے صحرا کی طرف چل نکلا۔ راستے میں ایک چھپر قسم کا تندور دکھائی دیا۔ جب سرِ شام نکلے تھے تو بھوک کا نام ونشان نہیں تھا، اب جو آگے آئے تو بھوک چمک اٹھی تھی۔ بھوک تو تالو سے چمٹی ہوئی ہوتی ہے۔

وہ جلد ہی خود کو منوا لیتی ہے تو اب حلیم خان نے اُس چھپر ہوٹل کے باہر قافلہ رکوایا۔ اندر داخل ہوئے تو ایک کردار جیسا ہمارے جیسا ہوتا ہے، سامنے آیا۔ ہم نے کہا، کھانا چاہیے۔ کچھ ہے تو بتاؤ۔

پہلے تو اس نے نگاہ میں آنے والوں کی گنتی کی۔ پھر بولا۔ آٹا تو گوندھا ہوا ہے مگر تندور آخری تمازت پر ہے۔ امام بخش چہکا کہ اس سے اچھا سمے تو تندور میں ہو ہی نہیں سکتا کہ جو بھی روٹی لگے گی، کڑک ہو کر باہر آئے گی۔ حلیم خان نے کہا، اب جو ہو سو ہو، روٹی تو کھائیں گے۔ اس نے روٹیاں لگا دیں۔ امام بخش بولا کچھ سالن یا پیاز مل جائے گا۔ وہ جہاں دیدہ تندورچی کہ سڑک پر تندور لگائے بیٹھا تھا، سوز مانوں کا مزاج دان تھا، پل میں پہچان گیا کہ قافلہ بھوکا ہے اور اُس کے پیٹ کی آگ صرف وہی مٹا سکتا ہے۔ اُس نے کہا، صاحب دودھ پر موٹی بالائی جمی ہے۔ وہ اتار لیں گے تو تندور کے آخری تاؤ کی روٹیاں بہت مزہ دیں گی۔ اب تو امام بخش نے گویا جھوم کر کہا، سائیں حلیم خان یہ تو قدرت کی عطا ہے۔ رات میں ایسا طعام تو پیغمبروں، اولیاء اور صوفیاء کے نصیب میں ہوتا ہے۔ ہمارا سفر سمجھو کہ صدیوں پرانا کوئی سفر ہے جو اب تکمیل پہ آنے لگا ہے۔ یہ کھانا سب نے کھایا تو اندیشہ ہوا کہ اس کھانے کا خمار کہیں راستہ کھوٹا نہ کر دے۔ اس پر حلیم خان نے کہا، دیکھو گاڑی میں چلا رہا ہوں اور دوسری جیپ میرا وفادار ڈرائیور چلا رہا ہے۔ اس لیے نیند کو ہم مات دے سکتے ہیں اگر امام بخش ساتھ ہو۔ اب بات امام بخش پر آ گئی کہ ایک قصہ گو کو ساتھ ہی اس لیے رکھا ہے کہ وہ قصے کا الاؤ تازہ رکھے۔ پھر بھلا الف لیلیٰ کی شہرزاد کس طرح اُس شہزادے کو سونے دے گی جو تلوار سونت کے بیٹھا ہے۔ لو جی اب سفر شروع ہوا اور امام بخش کا امتحان بھی۔ قصہ در قصہ۔ بیچ بیچ میں جب امام بخش ڈھیلا پڑتا تو فیض بخش تونسوی تان سنبھال لیتا۔ وہ قصے کی لڑی تونسہ شریف کی طرف موڑ کے لے جاتا۔ مثلاً ایسے کہ ایک بار ''رود کوہی'' کا موسم نہیں تھا۔ دریائے سندھ کو ایک بارات نے عبور کرنا تھا۔ اس وقت پانی

ایسا تھا کہ بارات گزر سکتی تھی۔اس لیے سب نے دریا میں قافلہ ڈال دیا مگر موسم کے تیور کچھ اچھے نہیں تھے۔''رود کوہی'' کا مطلب یہ ہے کہ جب تونسہ کے پہاڑوں پر بارش حملہ آور ہوتی ہے تو مٹی کے تودے اچانک بارش کے ریلے کے ساتھ دریا میں شور کرتے گرتے ہیں رود لہروں کو کہتے ہیں اور کوہی کا مطلب پہاڑ سے گرنے والا ریلا ہوتا ہے۔

بس تو ایسا ہی ہوا اور بارات کو ''رود کوہی'' نے آلیا۔رنگ برنگے کپڑے پانی کی طغیانی میں ایسے بکھرے جیسے پتنگوں کے کاغذ سطح آب پر پھیلے ہوتے ہیں۔بارات میں ڈولی بھی ہوتی ہے جس میں دلہن کو بٹھا کر لے جاتے ہیں۔سروں پر دُلہن کا جہیز بھی ہوتا ہے۔ غریبوں نے کوئی بستر، کوئی چارپائی کوئی صندوق کوئی برتنوں کا چھابا۔سب ایک ریلے میں صاف ہو گیا۔چند لمحوں میں پوری بارات تنکوں کی طرح بہہ گئی۔کہیں دو سو میلوں پہ کچھ کچلی مسلی ادھوری لاشیں پانی نے اُگل دی تھیں۔اگلے دن تونسہ شریف میں کسی گھر کا چولہا نہیں جلا۔خواجہ سلیمان تونسوی کے مزار پر کوئی دیا نہ جلا، نہ کسی نے کسی سے بات کی۔شہر کا اجتماعی پُرسہ ہوا نے ایسے دیا کہ ہر طرف بھٹکتی پھرتی تھی۔

''یار تم نے کیا قصہ سُنا دیا۔''حلیم خان نے گاڑی چلاتے ہوئے تونسوی سے کہا۔

''بس یونہی بات میں سے بات نکلتی ہے تو یہ بھی نکل آئی۔''

''اچھا اب بتاؤ کہ رات کا یہ کون سا پہر ہے۔''امام بخش نے حصہ لیا۔

''بہاول پور بس ستلج کے اِدھر ہے اور ستلج سامنے لیٹا ہوا ہے۔سارا دن نشے میں لیٹا رہتا ہے۔معلوم نہیں کس بات کا نشہ ہے۔''حلیم خان بولا۔

اب امام بخش نے پھریری لی اور تونسوی کے سنائے ہوئے واقعے کا تاثر بدلنے کے لیے ایک مقامی کہانی کہیں سے کھدیڑ کر برآمد کر لی۔

''ٹھہرو راستے کے لیے میرے پاس ایک انمول شے ہاتھ آئی ہے۔''

''اماموتو بہت چالاک ہے۔قصے موقع کی نسبت سے گھڑ لیتا ہے۔تیرے پاس

...ت کے ساتھ کوئی اور گُن ہے کہ کچھ بھی بولے وہ قصہ بن جاتا ہے۔" گویا حلیم خان نے اُسے پچکارا۔

"لیکن خان صاحب پہلے بہاولپور سے اپنے سفر کے لیے ضروری سامان تو لے لیں۔ آخر صحرا میں جا رہے ہیں۔ خشک خوراک اور دوائیں وغیرہ۔"

"وہ سب کچھ میرے آدمیوں نے لے لیا ہے۔ قلعہ ڈیراور پہنچ کر دم لیں گے۔ صبح کا ناشتہ وہاں ہے۔ سب انتظام ہے۔ تم ایک نواب کے ساتھ نکلے ہو امام بخش۔" حلیم نے نہ رکنے کا اشارہ دے دیا۔ اب گاڑیاں نہر پہ آ گئیں جہاں سے چولستان میں داخل ہونا تھا۔

"ہاں تو پھر امام بخش کیا قصہ نکالا ہے۔ شروع ہو جا۔ رات ڈھلنے والی ہے۔" یہ تونسوی تھا جو پیچھے سے بولا۔

"لو جی اب قصہ جیسے تندور سے نکلی ہوئی روٹی کی طرح پک چکا ہے۔ ماہر تندورچی کی طرح نکالتا ہوں۔ غور سے سنو یہاں سے قریب اُچ شریف ہے۔

یہ قریشیوں کی آبائی جگہیں ہیں۔

میں جانتا ہوں امام بخش تو کیا بتانا چاہتا ہے؟ سلیم خان چلّایا۔

میں ایک حقیقت سے پردہ اُٹھانا چاہتا ہوں کہ قریشیوں کا ایک فرزند انگلینڈ سے میم بیاہ کے لایا اور عین اسی قصبے میں اُسے لا کے رکھا۔ وہ بی بی خوش و خرم رہنے لگیں۔ ہر وقت زمینوں پر سبزیاں اور فصلوں کے ساتھ جڑی بوٹیاں اُگانے میں لگی رہتی تھیں۔ ایسے میں ایک بچی پیدا کر لی تھی۔ بچی کو پالا پوسا۔ جوان ہو گئی۔

"امام بخش تم زمانوں کو زمانوں میں ایسے ملاتے ہو جیسے کوئی مصالحے کو ہانڈی میں ملاتا ہے۔"

"اب یہ تو میرا آرٹ ہے۔"

”اب اُس بچی جو جوان ہوگئی تھی کا کوئی معاملہ ہے۔“

”ہاں معاملہ ہے کہ وہ بچی جدید ادب اور تاریخ اور فلسفہ پڑھ کے بے باک ہوگئی۔ انگلستان کی میم نے خود کو ایک دیہاتی عورت میں ڈھال لیا۔ اُس نے قریشی کی زمینوں، آبائی خانقاہ اور ڈیرے داری کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ سرائیکی زبان تک سیکھ لی۔ معمول تھا فجر کی اذانوں کے ساتھ اُٹھتی۔ جو دودھ بھینسوں اور گائیوں کا آتا، اپنی نگرانی میں اُس کو سنبھالتی، دہی، دیسی گھی اور پنیر کے لیے کچھ مشینیں بھی منگوالی تھیں۔ گویا اُس علاقے میں ولائتی بی بی نے علاقے کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ سب پیار سے انہیں ولائتی بی بی کہتے تھے۔ قریشی صاحب نے جب دیکھا کہ علاقے کی دیکھ ریکھ اور اثر ورسوخ کو قائم رکھنے والی بی بی آ گئی ہے اور سب اُس سے خوش ہیں تو اپنا ٹھکانہ اسلام آباد بنایا کہ سیاست اور کاروبار کے لیے اُس سے اچھی جگہ کہاں مل سکتی ہے۔ سو قریشی صاحب مہینے میں بس دو ایک بار آتے، علاقے کی خبر لیتے اور نکل لیتے ولائتی بی بی کے لیے علاقے کے لوگوں کے دُکھ سکھ کے ساتھ خانقاہ کے معاملات میں زیادہ آسودگی ملتی تھی۔ اُن کے ڈیرے پر دنیا کے مختلف ملکوں کے سفارت کار پکنک منانے آتے رہتے تھے۔ شکار کے شوقین عربوں کے لیے بھی چولستان میں گنجائش مقامی افسران نکال لیتے تھے۔ کچھ بڑے بینکوں کے افسران ساتھ میں ہوتے تھے اور اس ملی بھگت سے تلور، تیتر، بٹیر اور پھر ہرن کا شکار ماہرین کی مدد سے ان عرب شہزادوں کے لیے ممکن ہو جاتا تھا۔ ایک واقعہ ہے۔ اب امام بخش رُکا۔

”اب رُکے ہو تو کچھ تو ہوگا تمہارے پاس۔ ہم تو بس گُم متھان سن رہے ہیں۔“ کسی نے گرہ لگائی اور اماموں رواں ہوگیا۔

”تو یارو سنو۔“ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔“ کہ ایک ذات کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ پیچھے سے سیدزادہ ہونے کے باعث نام کے ساتھ شاہ لکھتا تھا۔ سب جگہ عزت گونج رہی تھی۔ اُسے معلوم ہوا کہ عرب شہزادہ شکار کے لیے آ رہا ہے جس کا طوطی سخاوت میں کل عالم

میں گونجتا ہے۔ ذات کے ڈپٹی کمشنر نے ایک بار خود دیکھا تھا کہ یہ عرب شہزادے چولستان کے شکار کے بعد جاتے ہیں تو اپنا سارا ساز و سامان اپنے خدمت گزاروں کو دے جاتے ہیں چاہے خدمت گزار کمشنر ہو۔ کور کمانڈر ہو یا بینک کا پریذیڈنٹ ہو تو جناب ذات کے ڈپٹی کمشنر کو جب معلوم ہوا کہ ہز ہائی نیس عرب شہزادے کا ظہور ریاست بہاولپور میں ہے تو اُس نے کہ خود بھی بزعم خود ادیبوں میں شمار ہونے کا دعویدار تھا، نے دو دنوں کے اندر اُس عرب شہزادے کی خاندانی اور شخصی بائیوگرافی مرتب کی اور اُسے آرٹ پیپر پر مہنگے طریقے سے تصویروں کے ساتھ لاہور سے شائع کرائی۔ اُس پر جو خرچہ آیا ہوگا وہ معلوم نہیں اُس کا ہوگا یا کسی ٹھیکیدار کا۔ مگر وہ کتاب چھپ گئی مگر شومئی قسمت سے عرب شہزادے کا دورہ ملتوی ہوگیا۔ اب اُس ذات کے ڈپٹی کمشنر کے ارمانوں اور لالچ پر جو اوس پڑی ہوگی وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ یہ ضمنی قصہ تھا اب آتے ہیں اصل کہانی پر کہ وہ ولائتی بی بی قریشی خاندان کو ہر لحاظ سے سنبھالتی رہی۔ اُس کی بیٹی کہ ادب، فلسفے اور تاریخ میں بہت آگے نکل چکی تھی۔ عالمی ادب کے افق پر ماں اور باپ کی وجہ سے نمودار ہوگئی تھی۔ باہر سے کتابیں چھپ کر مقامی اور غیر ملکی ادبی میلوں میں داد وصول پانے لگیں۔ خاص طور پر لندن، جے پور، دہلی اور کراچی میں انگریزی میں تاریخ، کلچر اور سیاست پر اس کی کتابوں نے تبصرے وصول کیے۔ اب کیا ہوا کہ قریشی صاحب کچھ دیر بیمار پڑے۔ ولائتی بی بی نے تیمارداری میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ قریشی صاحب نے جاتے جاتے کان میں یہ کہا کہ خاندانی زمینیں اور خانقاہ کے آس پاس جو باغ بغوچے ہیں ان پر اُن کے رشتہ داروں کی نظر ہے۔ جب میں گزر جاؤں تو میری بیٹی کو دستار بندھے گی اور یہ مقامی افسران کی مدد سے ہوگا۔ ایسے ہی ہوا اور ولائتی بی بی نے بیٹی کے سر پر دستار رکھی۔ علماء، مشائخ اور مولانا حضرات کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔ دو دن رات لنگر چلا۔ مقامی انتظامیہ، افسرانِ بالا اور محکمہ اوقاف کے افسران حاضر رہے اور کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ مگر پھر یہ ہوا۔''

''لو جی اب بڑی دیر بعد امام بخش نے پھریری لی ہے۔ کچھ بہت اہم انکشاف ہونے جا رہا ہے۔'' یہ حلیم خان تھا۔

''سفر میں آدمی کا دماغ چلتا ہے۔ بھائیو قصہ گو کو آسرا چاہیے ہوتا ہے۔ اور بس تو سُنو بیان سمیٹتا ہوں۔ ذرا غور..... تو پھر ایک دن ولائتی بی بی اور اُس کی ہونہار رائٹر بیٹی سے ملنے پولینڈ کا سفیر آیا کہ نوجوان تھا اور شاعری بھی کرتا تھا۔ پولینڈ کے ایک شاعر چیسلو میلاش کو نوبل انعام مل چکا تھا وہ ولائتی بی بی کی بیٹی کی شہرت سے متاثر ہو گیا۔ دونوں میں دوستی ہوئی اور پھر..... دونوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اب اتنی بڑی پراپرٹی کدھر جائے اور سب سے بڑا سوال کہ قریشی خاندان کی درگاہ اور وہ مریدین جو اُس سے وابستہ تھے کیسے اپنے پیرو مُرشد کے بغیر رہیں گے۔ اب ایسے میں ولائتی بی بی نے بیٹی کو خاموشی سے رخصت کیا اور خود سیاہ پوش ہو کر درگاہ کی نگرانی پر بیٹھ گئیں۔ علاقے کے عوام کے لیے تو وہ ویسے ہی ایک ماں کا درجہ رکھتی تھی۔ اس لیے مُریدین اور عوام نے ولائتی بی بی کے ہاتھ پر بیعت لینا شروع کر دی۔ یہ انوکھی بات تھی کہ جو ولائیت سے آئی تھی کہ ایک گوری خاتون پر علاقے کے لوگوں نے بھروسہ شروع کر دیا تھا اور اُس کی بیٹی ایک پولش ڈپلومیٹ سے شادی کر کے چلی گئی۔ پھر زمانہ گزرا اُس ولائتی بی بی نے باپ بیٹی کا بھرم رکھا۔ سب کچھ سنبھالا۔ زمین اور درگاہ کی دیکھ ریکھ کی۔ ہر طرح سے لوگوں کو خوش رکھا اور لوگ صرف ولائتی بی بی کو جانتے تھے۔ کوئی اُس کی بیٹی کو نہیں جانتا تھا کہ وہ آتی تھی اور پھر نکل جاتی تھی۔ خیر تو اب ایسا ہوا کہ ولائتی بی بی کی عمر کنارے آن لگی۔ وہ اب صرف عوام کو جن میں غریب عورتیں، بچے بچیاں ہوتے تھے، دعا دیتی تھی۔ وہ چاہتے تھے تعویذ لکھ دے۔ اُس نے تعویذ لکھنا بھی سیکھ لیا تھا۔ پھر لوگ چاہتے تھے وہ کچھ پڑھ کے پھونک مارے تو اُس نے بھی وہ سیکھ لیا۔ اب وہ اس درگاہ کی واحد وارث قرار پا چکی تھی۔ اب اُس کا وقت بھی آ گیا۔ بیٹی دور دیس میں تھی کسی نے انتظار نہ کیا اور ولائتی بی بی کی قبر بن گئی۔ وہ بھی اُس درگاہ کے پاس۔ اب ایک دن بیٹی

پروٹوکول کے ساتھ آئی۔ پھول چڑھائے اور مقامی انتظامیہ کو بتایا کہ یہ ایک ٹرسٹ کی جائیداد ہے اور اس کے تحت طلباء کو وظائف ملیں گے۔ مینیجر وغیرہ سب حاضر تھے۔ مگر پھر کیا ہوا کہ خاندانی درگاہ کی جگہ ولائتی بی بی کی درگاہ نے لے لی۔ اب اصل چڑھاوے اُس پر چڑھتے تھے۔ سب بھول گئے کہ کوئی قدیم درگاہ بھی تھی۔

''تو بھئی اصل کہانی بولو...... رات میں اب اونگھ آنے لگی ہے۔'' حلیم خان نے احتجاج کیا۔

''تو کہانی یہ نکلی ہے کہ اُچ شریف سے فاصلے پر ایک کھدائی میں ایک ہندو مندر نکلا ہے۔ کئی مورتیاں نکلیں۔ یہ جو اپنا قلعہ ڈیراور ہے اس کے پاس سرسوتی دریا کے کنارے ہزاروں سال پہلے جو تہذیب تھی، اُس میں بڑے بڑے کاہن تھے، پنڈت تھے، مہاجن تھے، بنیے تھے، کلال تھے۔'' امام بخش شروع ہوگیا۔

''یہ کلال وہ ہوتے ہیں جو شراب بناتے ہیں۔''

''ہاں نواب صاحب ٹھیک پہچانا۔'' امام بخش بولا۔

''اصل کہانی پہ آؤ۔''

''سنو۔ اب پہلی بار بتا رہا ہوں کہ بہاولپور کی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کی ٹیم نے یہ کھدائی کی تھی اور جب اندر سے پورا مندر نکلا تو اور کھدائی کی گئی۔ کئی اور مورتیوں کے ساتھ کچھ ہڈیاں اور کھوپڑی کے ساتھ کانوں، گلے اور ہاتھوں کے زیورات برآمد ہوئے۔ اصلی سونے کے۔''

''اصلی سونے کے۔''

''ہاں تو اور کیا۔ اب پوری ٹیم ششدر، سونا چمک رہا تھا۔ مٹی بھر بھری تھی۔ ذرا سا برش لگایا تو زیور چمک اٹھا۔'' امام بخش گنگ رہا تھا اور وہ بھول گیا تھا کہ گاڑیاں کشاں کشاں نہر پہ جارہی ہیں اور صبح سویرے قلعہ ڈیراور پہنچ جائیں گی۔ اب وہ پھر سے چالو ہوگیا۔

''صرف زیور ہی نہیں، ہڈیوں کے زیور سے الگ کیا گیا تو حیرت کی بات آگے آ گئی۔''

''اب کیا حیرت ڈال رہے ہو امام بخش......''

''یہی تو قصہ گو کا کمال ہے بھائی صاحب۔ حیرت، حیرت ہی تو کہانی ہے۔'' امام بخش بولا۔

''او کے، او کے امام بخش اب آگے بڑھو۔ جیسے ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ کوئی سیکس ڈالو۔'' حلیم خان نے گاڑی کو درخت سے بچاتے ہوئے کہا۔

''نواب صاحب سیکس میں اپنے پلّے سے نہیں ڈال سکتا۔ میں قصہ گو ہوں، کوئی دلال نہیں ہوں۔'' امام بخش چمکا۔

''ہاں ہاں یار ناراض نہ ہو۔ نواب صاحب بھی ٹائم پاس کر رہے ہیں۔'' اب کے منصور مہان بولا۔

''ہاں تو ٹھیک ہے۔ اب کہانی کو بیچ میں کانٹی تو نہ مارو۔''

''بولو بولو تو ہڈیوں کے ساتھ زیور نکلے سونے کے۔''

''ہاں ایسا ہی ہوا لیکن کھدائی کرنے والوں نے ذرا اور کھدائی کی تو اوزار کسی لوہے سے ٹکرایا بلکہ ٹھنٹھنایا تو اس پر کھدائی کرنے والے پروفیسر کا ماتھا ٹھنکا۔ ذرا اور کھدائی ہوئی تو ایک دیگ کا منہ نکلا۔ بس اب تو لگا کہ اژدھا، سانپ اور بچھوؤں کا لشکر کود پڑے گا۔''

''کیوں کُود پڑے گا؟'' منصور بولا۔

''وہ اس لیے کہ جہاں چھپا ہوا خزانہ ہوتا ہے اس کے آس پاس سانپ پہرہ دیتے ہیں۔'' امام بخش بولا۔

''اب سانپ کہاں سے نکال لائے ہو؟''

''سانپ ابھی نہیں نکلا۔ ابھی مندر میں سونا نکلا ہے۔ اس لیے کہ مندروں میں

سونا ہوتا ہے۔ سومناتھ کے مندر سے محمود غزنوی نے کتنا سونا نکالا تھا۔'' امام بخش بولا۔

''نہیں یہ جھوٹی کہانی ہے۔ محمود غزنوی نے سترہ حملے سونے کے خزانے نکالنے کے لیے نہیں کیے تھے جو وہ اونٹوں پر لاد کے لے گیا۔'' منصور مہان بولا۔

''کہاں گئے وہ اونٹ اور پھر وہ سونا تاریخ کا مذاق ہے یہ Bull shit۔'' حلیم نے کہا'' یہ صبح کاذب ہے اور اس لمحے میں تاریخ کا کوئی جھوٹ برداشت نہیں کروں گا۔''

''پھر سچ کیا ہے۔ اس تاریخی Bull Shit کو نہ مسلمانوں نے، نہ ہندوؤں نے چیلنج کیا ہے۔'' امام بخش بولا۔

''وہ اس لیے کہ دونوں کی قومی نرگسیت کا تقاضا تھا کہ اس تاریخی جھوٹ پر خاموشی اختیار کی جائے۔ اس میں دونوں کو تاریخ میں ہیرو بننے کا برابر کا موقع مل رہا تھا۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ اس واقعے کے نتیجے میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو لٹیرا ثابت کر دیا اور مسلمانوں نے خود کو بہادر ثابت کر دیا تھا۔'' منصور مہان بولا۔

''تو کیا یہ واقعہ تاریخ کے گودام میں اسی طرح پڑا ہوا ہے یا کسی نے اس پر غور بھی کیا ہے؟'' امام بخش بولا۔

''اب ایک ہندو مورخ نے غور کیا اور تحقیق کر کے بتایا کہ ہندو اور مسلمان دونوں کا یہ جھوٹ اب تک طاقت دیتا رہا ہے۔ اس لیے کسی نے اسے چیلنج نہ کیا۔'' منصور مہان نے امام بخش پر سکور کر دیا تھا۔

حلیم خان نے گاڑی کو صحرا میں ڈالا تو گاڑی ایسے چل رہی تھی جیسے رن وے پر بڑا جہاز دوڑتا ہے۔ منصور مہان بہت حیران ہوا کہ پہلی بار وہ چولستان میں داخل ہو رہا تھا۔ اُس کی حیرت کو حلیم خان نے دور کیا کہ یہ جگہ بھی ریتلی تھی مگر بارشوں نے اسے اس طرح سے سیمنٹ بنا دیا جیسے سیمنٹ کا فارمولا ہوتا ہے۔ ویسے یہ بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی مگر وہ

رن وے تھا اور دونوں گاڑیاں تیر کی طرح نکلتی جا رہی تھیں۔ جو کہانی بیچ میں رہ گئی تھی اب اُس نے سر اٹھایا کہ مندر کھدائی میں نکلا۔ پھر اس مندر کے ساتھ کچھ ہڈیاں اور کانوں اور گلے کے زیورات برآمد ہوئے اور پھر دیگ نکلی۔ اب اُس میں کیا تھا۔ اُس دیگ کو کھولا گیا تو اس میں سونا تھا۔ یہ بات امام بخش نے بتائی۔

''یہ سونا اب کہاں ہے۔'' یہ سوال حلیم خان نے کیا۔

''وہ سونا نکلا ضرور لیکن اب معلوم نہیں کہاں ہے۔'' یہ بات امام بخش نے بتائی۔

''اچھا تو بتاؤ کہانی کہاں گُم ہو گئی۔''

''کہانی اب یہ تھی جو میں نے اُسی زمانے کے واقعات کو مائیتھالوجی میں پڑھی تو میرا ایمان اس کہانی پر آ گیا۔'' امام بخش بولا۔

''کیا کہانی بنی۔''

''کہانی یہ بنتی ہے کہ ایک بادشاہ تھا، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ...... مگر وہ ٹھاکر تھا اور اُس نے ظلم کے پہاڑ توڑے تھے رعایا پر۔ ایک دن اُسے معلوم ہوا کہ ایک کلال کی بیٹی بہت خوبصورت ہے۔ وہ شراب بناتی تھی اور پھر شراب میں اپنا عکس ڈالتی تھی جس سے شراب کی تاثیر دوگنا ہو جاتی تھی۔ اب تو ٹھاکر نے اُس شراب سے یہ جانا کہ کس کے عکس نے نشہ بڑھایا ہے، اگر اُسے میں محل لے آؤں تو نشہ کیا ہو گا۔ سو اُس نے کلال سے بات کی مگر کلال کی بیٹی نہ مانی۔ ٹھاکر پہلے حیران ہوا، پھر اُسے غصہ آیا اور وہ سات دن سات راتیں سو نہ سکا۔ پنڈت، کاہن، کارندے، کارپرداز اور مہاجن سب جمع ہوئے اور وید، حکیم اور صلاح کار نے مل کر ٹھاکر کو سمجھایا مگر وہ نہیں مانا اور پھر طفیلیوں، خوشامدیوں اور سپہ سالار نے فیصلہ کیا کہ لڑکی کو اُٹھا لیا جائے۔ اب ایک کلال کی چھوکری کو اٹھانے میں کیا کشٹ تھا۔ سو کلال کی بیٹی پہنچی ٹھاکر کے محل میں یا جو بھی اُس کا گھر ہو گا۔''

''پھر کیا ہوا۔ جلدی بتاؤ۔ اب ہم قلعہ ڈیرا ور پہنچنے والے ہیں جہاں ہمیں ناشتہ

کرنا ہے۔''حلیم خان نے خبردار کیا۔

''سائیں کہانی ختم پیسہ ہضم۔''امام بخش نے تسلی دے کر کہا۔

''تو ہوا یہ کہ کلال کی بیٹی تھی بہت اڑیل۔ضد پر آ گئی کہ اب میں کسی بھی صورت ٹھاکر کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گی۔ٹھاکر حیران کہ ایک کلال کی بیٹی اور اتنا غرور...... جب سات راتیں سات دن گزر گئے تو اُس کا جلال جاگا اور اُس نے اُس لڑکی سے کہا، کیا چاہتی ہے۔میں تمہیں سونے میں تول سکتا ہوں۔اس پر لڑکی اٹھی اور بولی کہ مجھے اسی لمحے کا انتظار تھا۔مجھے سونے میں تولو، اب تو محل میں کھلبلی مچ گئی۔ترواز میں ایک طرف کلال کی لڑکی بیٹھی اور دوسرے پلڑے میں سونے کی دیگ۔مگر بات یہاں تک نہیں رُکی۔''

''او امام بخش، اب اور کیا سسپنس ہے؟''حلیم بولا۔

''نہیں کچھ نہیں۔''امام بخش بولا۔اب منصور مہان سو چکا تھا اور تونسوی ادھ مُوا ہو چکا تھا۔

''تو قصہ ختم کروناں۔''حلیم خان بولا۔

''ٹھاکر سے کلال کی بیٹی نے کہا، سنو میرا جسم استعمال کر لو مگر روح پر میرا اختیار ہے۔جب میں مروں تو میری لاش کے ساتھ یہ سونے کی دیگ دفن کر دینا۔ٹھاکر نے بات سنی اور اقرار کر لیا کہ ایسا ہی ہوگا۔اہتمام ہو گیا۔ٹھاکر نے حجلہ عروسی سجایا۔علاقے میں خوشیوں کا سماں بندھ گیا۔ٹھاکر کے لیے نذرانے اور رعایا کی دعاؤں نے سماں باندھ دیا۔ٹھاکر سنگھاسن پر بیٹھا کہ یہ ٹھاکر کی جیت تھی۔اب یوں ہوا کہ ٹھاکر ہر طرح کی آتش بازی اور ریاست کی ضروری تفریحات سے فارغ ہوا تو اپنے حجلہ عروسی میں گیا۔وہاں بے حد خوبصورت لڑکی کہ کلال کی بیٹی تھی۔بستر پر لیٹی تھی۔ٹھاکر نے دیکھا کہ ایک چندے آفتاب چندے ماہتاب لڑکی اُس کے بستر پر لیٹی ہے۔وہ اس کے پاس آیا۔محبت بھرے ہر طرح کے بول بولے اور پھر اُسے چھوا۔پھر اُس کی محبت میں اُس کے ہونٹ چومے مگر ہونٹ

ساکت تھے۔ وہ کسی اور دنیا میں جا چکی تھی۔ اب تو ٹھاکر کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ سب پنڈت، کاہن، کارندے، مہاجن اور ریاست کے کارپرداز جمع ہوئے اور کلال کی بیٹی کو پورے اعزاز کے ساتھ مندر میں سونے کی دیگ کے ساتھ دفنا دیا گیا کیونکہ ٹھاکر نے اپنی بات کا پالن کیا تھا۔''

''تو یہ جو ہڈیاں اور سونا نکلا ہے، یہ اُسی کہانی کا ثبوت ہے۔''

''ہاں حلیم خان یہ اُسی کہانی کا ثبوت ہے۔''

اب قلعہ ڈیراور سامنے دھوپ میں چمک رہا تھا اور قافلہ اُتر چکا تھا۔ دونوں گاڑیوں میں سے حلیم خان کے لاؤ شکر اور ساز و سامان سے لیس لوگ باہر آئے۔ قصہ گو امام بخش کے لیے روہی دھوپ جلی اور چولستان کا لق و دق صحرا منہ کھولے کھڑا تھا۔ صبح تو ذرا ٹھنڈی ٹھار تھی کہ دکھن کی ہوا چل رہی تھی۔ قلعہ ڈیراور کے باسی کب کے اٹھ چکے تھے۔ صبح کی ہوا انہیں اٹھا دیتی ہے۔ بزرگ، بابے اور وڈیرے سب جمع تھے۔ خوب سواگت ہوا۔ گِلے گُمازی ہوئی۔ محبت کے لاڈ پیار ہوئے۔ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان پر کھیس ڈال دیئے گئے۔ چند درخت، کنویں کے آس پاس اسی کام آتے ہیں۔ ناشتہ تیار تھا اور رومالوں اور چنگیروں میں پراٹھوں کا ڈھیر چُن دیا گیا۔ لسی کے جگ جو تانبے کے تھے، ان پر قلعی کی گئی تھی۔ وہ ترتیب دیے گئے۔ مکھن بھی تانبے کے کٹوروں میں لایا گیا۔ مکھن اُسی صبح ہی بلویا گیا تھا۔ ریشم سے نازک مکھن پراٹھوں کے ساتھ چولستانی زنانیوں نے انڈوں کا خاگینہ بنایا تھا۔ ناشتہ لگ رہا تھا مغرب کی جانب سے شور اٹھا۔ ایک سیانے نے آگہی دی کہ ناشتے کی چارپائیوں کو جلدی سے ہٹا دیا جائے۔ اونٹوں کی ڈار سو میل کی رفتار سے آندھی بن کر آ رہی ہے۔ اب کیا دیکھا چشم فلک نے کہ قلعہ ڈیراور سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر سینکڑوں ننگے کوہان کے ساتھ اونٹ سو میل کی رفتار سے آ رہے تھے۔ اب یہ ہوا کہ سب اپنی جان بچانے کے لیے قلعہ کی اوٹ میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ کچھ وہاں کی تاریخی مسجد میں جا کر جان

بچانے کے لیے دوڑے۔ چشم زدن میں سینکڑوں اونٹ آندھی کی طرح آئے اور گزر گئے۔
امام بخش حیران درخت کی اوٹ میں کھڑا دیکھتا رہا۔ اس نے یہ منظر پہلی بار دیکھا تھا کہ یہ اونٹوں کا کاروان کدھر سے آیا اور کدھر گیا۔ جو بھی ان کی زد میں آ جاتا وہ بوٹی بوٹی ہو سکتا تھا۔ چولستان میں اس طرح کے اچانک رونما ہونے والے کئی طرح کے واقعات سننے میں آتے رہتے ہیں۔ مثلاً اچانک ایسی آندھی آتی ہے کہ جو بھی اُس کی لپیٹ میں آ جاتا ہے، دس سے بیس میل دور کسی ٹیلے میں دبی اُس کی لاش بھی کوئی نہیں ڈھونڈ سکتا۔ ایسی آندھیاں پرانے ٹیلے مٹا دیتی ہیں اور نئے ٹیلے کھڑے کر دیتی ہیں۔ اس لیے وہاں کوئی نشانی مستقل نہیں ہوتی۔ امام بخش نے اونٹوں کا ایک واقعہ سنایا کہ اسی چولستان میں اونٹ کا کینہ دیکھنے میں آیا۔ شُتر کینہ تو کتابوں میں پڑھا تھا مگر امام بخش نے چولستان کا واقعہ سنا دیا۔ ابھی اونٹوں کا منظر پیش ہی آیا تھا کہ یہ واقعہ سب کے جسموں میں کپکپی پیدا کر گیا۔

قلعہ ڈیراور کے قریب چند درختوں کے نیچے چارپائیوں پر کھیس دوبارہ بچھائے گئے۔ ناشتہ لگانے والے قطار میں کھڑے تھے۔ اونٹوں کا غول بیابانی آندھی کی طرح آیا اور چارپائیوں کو پھلانگتا ہوا نکل گیا۔ اب امام بخش کے گلے میں ایک اور کہانی اٹک گئی تھی۔ اُسے بھی سب نے کہا کہ سن لیتے ہیں۔ امام بخش کو گویا گویائی مل گئی۔

''تو صاحبانِ عالیشان، اسی چولستان میں ایک زمانہ گزرا۔ ایک چولستانی کو اپنی اونٹنی پر غصہ آ گیا اور اُس نے اونٹنی کو چھمکوں سے اتنا مارا کہ وہ بے حال ہو کر گر گئی۔ چھمک بھلا کسے کہتے ہیں۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ ہاں معلوم ہے نازک شاخیں جو کبھی نہیں ٹوٹتیں کہ اتنی لچکدار ہوتی ہیں۔ البتہ جس کے جسم پر برستی ہیں، اسے توڑ دیتی ہیں۔ ہاں تو اُس اونٹنی کا نونہال بچہ جسے ''توڈا'' کہتے ہیں یہ سب ظلم اپنی ماں پر ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اور پھر وہ چولستانی بھول گیا کہ اُس نے ایک اونٹنی کا بچہ پال پوس کے اونٹ میں تبدیل کیا ہے۔ اب وہ اونٹ اپنی ماں کا انتقام لینے کے لیے تیار تھا۔ چولستانی اب جوان بھی نہیں

رہا تھا لیکن ہر چولستانی کو چوکنا ہونا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اونٹ نے اپنی ماں کا انتقام لینے کے لیے موقع تلاش کیا۔ جب چولستانی نے اُس اونٹ کے کجاوے میں بسرام کیا اور اونٹ چلا تو سامنے کُھلا اور ننگا صحرا تھا۔ اس سے بہتر موقع ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اونٹ نے اپنا بدلہ لینے کے لیے کوہان کو حرکت دی اور چولستانی کو مطلب سمجھ میں آ گیا کہ اُس کا چہیتا اونٹ کچھ کرنا چاہتا ہے۔ چولستانی کہ دانش رکھتا تھا، سوچا کہ اونٹ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ اُس کے ساتھ میں نے کوئی ناانصافی تو نہیں کی۔ بس یہ سوچنا تھا کہ اُسے یاد آیا جب یہ معصوم بچہ تھا تو اُس کے سامنے اس کی ماں کو چھمکوں سے میں نے مارا تھا۔ جب یہ بات اُسے یاد آئی تو چولستانی کو اُس اونٹ نے جھٹکے سے گرا دیا اور وہ بھاگا کسی سہارے کے لیے مگر صحرا میں سہارا نہیں ہوتا۔ اب چولستانی کو اندازہ تھا کہ قلعہ ڈیراور قریب ہے اور وہاں درخت بھی ہیں تو وہ اونٹ کو غچہ دے کر بھاگا۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر آخر وہ ساربان تھا، اس لیے وہ اونٹ کا کینہ سمجھ چکا تھا۔ اس لیے وہ جان بچانے کے لیے بھاگا اور اونٹ نے جیسے اپنی فطرت کی آواز سُن لی تھی، اب ایسا ہوا کہ ایک تنہا درخت سامنے آ گیا۔ وہ ساربان جان بچانے کے لیے اُس درخت پر چڑھ گیا۔ اونٹ بے بسی میں وہاں نیچے رُک گیا۔ پہلے اُس نے درخت کو گرانے کی کوشش کی۔ چولستان کا درخت معمولی نہیں ہوتا۔ اس کی جڑیں بہت نیچے جا چکی ہوتی ہیں۔ اب اونٹ خاموشی سے بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ کب اُس کا ملزم اور شکار نیچے گرتا ہے۔ وہ چولستانی درخت پر جان بچانے کے لیے بیٹھا رہا۔ نیچے دشمن کھڑا تھا۔ اب ایک دن، دو دن، چار دن اور چار راتیں گزر گئیں۔ پیٹ میں نہ پانی نہ روٹی رزق گیا تو کیا تاب لا سکتا تھا جبکہ اونٹ کی کوہان میں تو کئی دنوں کا رزق ہوتا ہے۔ اسے تو کسی بھی باہر کی امداد کی ضرورت نہیں ہوتی تو آخر ایک دن اوپر کی شاخ سے ایک مردہ نیچے گرا اور اونٹ نے اسے اپنے چاروں پاؤں سے ایسا کچلا کہ کوئی دیکھنے والا ہی نہیں تھا۔ بس وہ وہیں پر ریت کی خوراک بن گیا۔ اونٹ آگے بڑھ گیا۔ اس نے

ماں کا بدلہ لے لیا تھا۔"

"امام بخش تمہیں یہ قصے خواب میں آتے ہیں۔" حلیم خان بولا۔

"نہیں خواب مجھے کھلی آنکھوں میں دکھائی دیتے ہیں۔" امام بخش بولا۔ "بلکہ خواب بھی اب نہیں آتے۔ پوری کی پوری کہانی آنکھوں میں آ کر بیٹھ جاتی ہے۔"

اب ناشتے کا سما چار ہو رہا تھا۔ چولستانی عورتوں نے پراٹھوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ بندہ آدھا پراٹھا بھی کھا لے تو دو قدم نہ چل سکے۔ وہاں تو پراٹھوں کا پہاڑ لگ گیا تھا۔ کس مٹی سے بنی تھیں وہ چولستانی زنانیاں اور ان پراٹھوں پر گھی کدھر سے آیا۔ اونٹنی کے مکھن کا دودھ یا بکریوں کے دودھ کا مکھن۔ نہیں یہ مکھن بھینسوں اور گائیوں کا تھا کہ خوشبو یہی بتا رہی تھی۔ اس لیے کہ چولستان میں ہر طرح کا جانور یہاں تک کہ ہرن، ہرنیاں بھی بسرام کرتی ہیں۔ اب لسی کے جگ ایک قطار میں لگ گئے۔ پراٹھے، لسی اور مکھن یہ ناشتے کا اصلی سامان تھا مگر انڈوں نے بھی بہت گھڑمس مچایا ہوا تھا۔ مطلب یہ کہ انڈوں کو پھینٹ پھینٹ کر ایسے بنایا تھا جیسے بندے کو مار مار کے دُنبہ بنایا جاتا ہے۔ اب مہمان تو گنتی کے تھے اور پراٹھوں کا ڈھیر تو بارات کا تھا۔ جلدی سب نے ہاتھ اٹھا لیا اور امام بخش نے بتایا کہ چولستان میں داخل ہونے کا وقت اب شروع ہو گیا ہے۔ اگر بیچ دوپہر نکلیں گے تو دھوپ اور ہواٹیلوں کی شکلیں بدل دے گا۔ اس لیے یا تو یہی وقت مناسب ہے یا پھر بعد از دوپہر ہو سکتا ہے۔ فیصلہ تو حلیم خان نے کرنا تھا، سو اس نے اپنی جیپ کے ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھا اور صرف دو گاڑیوں کا قافلہ نکلا اور اس قافلے میں پہلی گاڑی میں حلیم خان، امام بخش، تونسوی اور منصور مہمان تھے۔ پچھلی گاڑی میں ملازمین تھے جس میں باورچی، تندورچی اور خیمہ لگانے والا تھا۔ اب یہ قافلہ نکلا اور ہرنوں کی تلاش میں پورے چولستان میں پھیل گیا۔ اب ایسا تھا کہ چولستان میں ہرنوں کی تعداد شکاریوں نے محدود کر دی تھی۔ میلوں تک گاڑیاں بھاگتی تھیں اور ہرن نام کی کوئی شے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ صرف گیدڑ اور صحرائی کیڑے مکوڑے ہی سامنے دکھائی دے

رہے تھے لیکن حلیم خان کی مخبری تھی کہ انڈیا کی سرحد کے ساتھ جو باڑ لگائی گئی ہے، کئی دفعہ انڈیا کی طرف سے ہرن ادھر آنے کی کوشش میں سینگ پھنسا بیٹھتے ہیں۔اس لیے اگر دو چار ہرن اس طرح باڑ میں پھنسے ہوئے پائے گئے تو انہیں باڑ کاٹ کر ادھر آنے کی اجازت دی جا سکتی ہے اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اُدھر کے ہرنوں کی بُو پا کر اِدھر کے ہرن خیر سگالی کے لیے وہاں موجود ہوں اور انہیں موقع مل جائے۔اب اس چکر میں دونوں جیپوں نے کچھ ضروری اشارے اور آوازیں آپس میں طے کر لیں اور کھوجی اگلی جیپ میں بٹھا دیا گیا جو راستوں کی پہچان رکھتا تھا۔واحد سہارا وہ کُہنہ سال اور تجربہ کار چولستانی کھوجی یا گائیڈ تھا جو شکاریوں کے ساتھ سفر کیا کرتا تھا اور اپنی خدمات کے عوض کوئی معاوضہ نہیں لیتا تھا۔سال کے سال ان جاگیرداروں، وڈیروں اور لاڈلے بیوروکریٹس سے اپنی مرضی کا معاوضہ لیتا تھا جس میں گندم، فصل، نقد انعام یا کوئی امداد شامل ہوتی تھی۔سالخوردہ چولستانی کا نام بخشیندہ تھا۔بخشیندہ کم بات کرتا تھا۔صرف اشاروں میں بولتا تھا۔اُس کی عمر کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا تھا۔جو شخص دھوپ میں پیدا ہوا اور دھوپ میں ہی بڑا ہوا اور اب چلتے چلتے اس عمر کو پہنچا ہو۔اُس سے صحت مند آدمی کوئی کیا ہو سکتا تھا۔اس لیے کہ نہ تو وہ کبھی ڈاکٹر کے پاس گیا، نہ حکیم کے پاس نہ ہی وہ کسی مقامی ٹوٹکوں سے کام چلانے والے سیانے کے پاس گیا۔ اُس کا کہنا تھا کہ ساری زندگی میں اُسے نہ کبھی بخار ہوا ہے نہ زکام ہوا ہے نہ ہی کوئی اور عارضہ۔وہ پیدائش سے اب تک بس چلتا ہی رہا ہے کہ یہ اُس کا پیشہ تھا۔باپ سے یہ پیشہ اُس نے ورثے میں لیا اور اب اُس کا بیٹا اس پیشے کا حقدار تھا۔

چولستان ایک چٹیل صحرا ہے۔نہ درخت نہ آبادی نہ کوئی نشانی تو ایسے میں سارا بھروسہ بخشیندہ پر تھا۔دونوں جیپیں آگے پیچھے جا رہی تھیں لیکن اچانک خوفناک آندھی سامنے سے آ گئی اور سب کچھ سیاہ مٹی کی دیوار میں پھنس گیا۔اب وہاں کچھ بھی باقی نہ بچا۔ جیپیں اُلٹ گئیں مگر دونوں جیپوں کے بیچ ہواؤں نے فاصلے پیدا کر دیئے اور بخشیندہ اپنی

تمام تر ذہانت اور حکمت کے باوجود ریت کے ڈھیر میں دب گیا۔ اس طرح کی آندھیاں بھی چلتی تھیں، ان کا حساب کتاب بخشیندہ کے بس میں نہیں تھا اور اگر معلوم بھی ہو جاتا جب تو اُس کے لیے تیار ہونے کی کوئی صورت موجود نہیں تھی۔ یہ ایک قیامت کا سماں تھا جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

ذرا درمیان میں امام بخش سانس لینے کے لیے رکا۔ آہ بھری اور یہ شعر سنایا:

چلی سمتِ غیب سے اِک ہُوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جِسے دل کہیں سُو ہری رہی

اس شعر میں شاخِ نہالِ غم دراصل اپنی طرف اشارہ تھا۔ امام بخش کے سامنے سب گم متھان بیٹھے اُس کی درد کتھا پہ دوزانو کان دھرے بیٹھے تھے۔ کچھ لمحے وہ چپ رہا۔ خاموشی اور چُپ کا فرق سب کو اُس دن معلوم ہوا کہ خاموشی بھی بولتی ہے مگر چُپ بول نہیں سکتا۔ اس لیے چپ لگ جانا ایک سناٹا ہوتا ہے تو ایسا ہی ہوا۔ آخر کو امام بخش گویا ہوا کہ جب ریت میں دبے سانس رُکنے لگی تو اپنے تیئں جنبش کی اور محسوس کیا کہ پہلے سانس کو بحال کرنا چاہیے۔ ناک اور گلے پر دباؤ ڈالا کہ جو کچھ پھنسا ہے پھیپھڑوں کی طاقت سے نکل جائے۔ اس جدوجہد میں سانسیں تہہ و بالا ہوئیں اور دیر تک بحالی ممکن نہ ہو سکی۔ پھر زور لگایا کہ زندگی ابھی باقی ہے تو اسے بچا لیا جائے۔ اب آنکھوں سے ریت کی چبھن کو محسوس کر کے تکلیف میں جو میں چیخا تو ساتھ ایک اور چیخ بھی سنائی دی۔ حلیم خان کہیں قریب میں جیب کے اندر سے کراہتا تھا، جیپ آدھی اُلٹ چکی تھی۔ منصور مہان کا پتہ نہیں تھا۔ میں اٹھا اور ہاتھ مارنے لگا۔ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرا ہاتھ حلیم خان پر پڑا۔ ریت ناک کے راستے گلے میں آ چکی تھی۔ سانس بحال کرنے کے لیے بڑے جتن کیے، الٹا ہو کر کئی بار کھانسا اور شکر اللہ کا کھانسی نے زور پکڑا اور ریت آگے پیچھے اِدھر اُدھر سے اندر سے باہر سے سانس کی نالی سے متحرک ہو کر فارغ ہو گئی۔ اب میں سانس لے سکتا تھا۔ حلیم خان سٹیئرنگ میں پھنسا تھا۔ اس کی

سانسیں بحال تھیں مگر جسم کئی طرح کے جھٹکوں سے روئی کی طرح دُھنک رہا گیا تھا۔ اسے نکالنے میں مجھے کچھ وقت لگا۔ اب منصور مہان کی کھانسی نے متوجہ کیا۔ ذرا فاصلے پر وہ ریت میں پھنسا ہوا تھا۔ اسے میں نے اٹھا کر ایک طرف ڈالا اور اُس کے منہ اور ناک پر پھونکیں مار کے اُسے الٹا کر کے پیٹھ پر مکے مارے۔ اس سے اس پر کھانسی کا دورہ پڑا اور بڑی مشکل سے وہ بحال ہوا مگر وہ نہ دیکھ سکتا تھا نہ سن سکتا تھا۔ آنکھوں اور کانوں میں ریت بھر چکی تھی۔ معلوم نہیں یہ رات کا کونسا پہر تھا، آندھی گزر چکی تھی مگر ہوائیں اب بھی چل رہی تھیں۔ ہم میں سے کوئی بھی بول نہیں سکتا تھا۔ مجھے اتنا احساس تھا کہ میں زندہ ہوں اور حلیم خان چت لیٹا تھا۔ کبھی کبھی ریت کے ذرّے اُسے تنگ کرتے تھے۔ منصور مہان نے بڑی تگ و دو کے بعد سانس قابو میں کیا۔ اب سانسیں چل تو رہی تھیں مگر اور کچھ بھی کسی کے بس میں نہیں تھا کہ صبح ہوئی۔ سورج تلوار سونت کر آ گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ لق و دق ریت کا صحرا۔ اب خبر لینی تھی دوسری جیپ کی جس میں بخشیندہ تھا۔ میں اُٹھا اور چاروں سمتوں میں ایک ایک کوس گیا کہ یہی ایک طریقہ تھا۔ چاروں کھونٹ گھوم آیا تو اُس جیپ کا سراغ نہ ملا جس میں ہمارا راہبر اور راستہ دکھانے والا سمت نما بخشیندہ تھا۔ اس پر امام بخش نے گرہ لگائی کہ

ع نہ کوئی بخشیندہ رہا نہ کوئی بخشیندہ نواز

جب میں چاروں سمتوں سے مایوس ہو گیا تو ہم تینوں نے اپنی زندگیوں کو خطرے میں پایا اور پہلے تو اپنے ارادے پر لعنت بھیجی، پھر حالات کو قابو میں کرنے کے لیے اپنی جیپ کو مشکل سے سیدھا کیا۔ اب اُسے سٹارٹ کرنے کی کوشش کی تو چابی ہی نہیں گھومتی تھی۔ ہم تینوں نے پہلے سائلنسر کو صاف کرنے کی پوری کوشش کی۔ پھر حلیم خان نے گاڑیوں کا مالک ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے انجن کھولا اور پھر اندر ریت نے جہاں جہاں ٹھکانہ کیا تھا، اُسے صاف کرنا شروع کیا۔ پھر چابی گھمائی۔ گھوں گھوں گھوں جس کا مطلب تھا بیٹری کام کر رہی ہے۔ اب جب اوپر آسمان کو دیکھا تو سورج سوا نیزے پر تھا۔ جیپ کی

تلاشی لی تو پانی نکل آیا۔ کچھ بیکری سے لی ہوئی خوراک بھی موجود تھی مگر ہمیں پتہ نہیں تھا کہ ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ حلیم خان نے جیپ کو سٹارٹ کرنے کے سو جتن کر دیئے۔ مطلب یہ ہے کہ ریت کو صاف کرنے کے لیے ہر پُرزے کو کئی کئی بار صاف کیا۔ آخر میں جیپ سٹارٹ ہوگئی۔ اب کسی کو معلوم نہیں کہ کس سمت جانا ہے۔ کتنا پیٹرول ہے اور کیسے یہاں سے نکلنا ہے۔ ہم تین لوگ جیپ میں بیٹھ گئے اور اندازے سے ایک طرف نکلے۔ پانچ کلومیٹر پر رُک گئے۔ چاروں طرف لق ودق صحرا تھا۔ اب کسی کے پاس کوئی نسخہ نہیں تھا کہ کدھر کو جائیں۔ جب سمتیں گُم ہو جائیں تو پھر صرف آپ اپنی قسمت کو یاد کرتے ہیں۔ ہم نے بھی یاد کیا اور ایک سمت کو جیپ دوڑا دی کہ شاید کوئی کنارہ یا کوئی آبادی مل جائے مگر ایسا نہ ہوا۔ اب جیپ کو چاروں کھونٹ دوڑایا گیا۔ شاید یہ ہماری غلطی تھی، ہر سمت بے کنارا تھی۔ اس لیے دوسری سمت لوٹ جاتے تھے۔ پھر تیسری سمت اور جب حلیم خان نے بتایا کہ پیٹرول کا ایک کین باقی رہ گیا ہے تو ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ اندر سے ہم سب بے حد ڈر گئے تھے۔ صرف معجزوں پر اب ہمارا انحصار تھا کہ اچانک ہماری تلاش میں کوئی ہیلی کاپٹر فضا میں نمودار ہوگا یا کوئی پارٹی ہماری تلاش میں کسی سیانے کھوجی کی سربراہی میں نکلے گی اور ہمارا سراغ لگا لے گی یا پھر اچانک ہم کسی آبادی یا پانی کے ٹوبھے کے پاس آ نکلیں گے۔ ہمارے حواس جواب دے گئے تھے۔ سوچنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ جو بھی ہمارے پاس تھا وہ محض بدحواسی تھی۔ ایک پیٹرول کا کین اور اوپر چمکتا سورج! مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ایک پیٹرول کا کین کہاں تک سفر کر سکتا ہے۔ اب ہم زندگی کا سراغ لگانا چاہتے تھے۔ کوئی جانور دکھائی دے جس کے پیچھے ہم جائیں کہ کسی جانور کا ہونا زندگی کے کہیں قریب ہونے کی نشانی ہو سکتا تھا مگر نہ کوئی اونٹ، نہ کوئی بھیڑ، بکری نہ کوئی لومڑی۔ نہ کوئی ہرن۔ کچھ بھی ہمارے سامنے نہ آیا نہ گزرا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم کچھ اس طرح سے بھٹکے کہ نہ ہم انڈیا کی سرحد کی باڑ کے قریب تھے نہ ہم چولستان میں کسی ایسی جگہ تھے جہاں قریب کوئی آبادی

کے آثار ہوں۔ یہ تک پتہ نہیں تھا کہ چولستان کا رقبہ کتنا ہے اور اُس کی سرحدیں کس کس علاقے سے ملتی ہیں۔ اب ہم نہتے آسمان کے رحم وکرم پر تھے۔ ایک سوچ آئی کہ ابھی کچھ فیصلہ نہ کریں اور پیٹرول کا کین سنبھال کے رکھیں لیکن پچھلے چوبیس گھنٹوں سے ایک تنکا اور ایک قطرہ پانی پیٹ میں نہیں گیا تھا۔ انسان ایسے میں دماغ کو تو بچا سکتا ہے، جسم کو نہیں بچا سکتا۔ جسم آہستہ آہستہ اُس زمین کی طرح پگھلنے لگا جو دریا بُرد ہو رہی ہوتی ہے۔

امام بخش اب ذرا سانس لینے کے لیے رُکا ہم سب جو سامنے بیٹھے بت بنے یہ سن رہے تھے، ہمارا ابھی آدھا خون خشک ہو گیا تھا۔ اب امام بخش نے اپنی آنکھوں کے بنٹے گھمائے اور پھر سے رواں ہو گیا۔ کیونکہ کسی کو اُس سے سوال کرنے کی ہمت نہیں تھی۔

اب ہم میں سے پہلے جس نے ہمت ہاری وہ منصور مہان تھا۔ اس لیے کہ وہ اس طرح کے تجربے سے شاید پہلی بار گزر رہا تھا۔ ویسے تو یہ تجربہ ہم دونوں کے لیے بھی پہلی بار تھا لیکن میں اور حلیم خان چولستان میں ہرن کے شکار کے لیے پہلے بھی کئی دفعہ آ چکے تھے۔ اب ہم منصور مہان کو کیا سنبھالتے وہ روئے جا رہا تھا کہ میری دو چھوٹی چھوٹی بیٹیاں ہیں۔ میری بیوی میرے بچے کو جنم دینے والی ہے۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے رخصت کرتے ہوئے چھوٹی بیٹی نے کہا تھا۔ وہ پھر رونے لگا۔ ہچکی کے بعد بولا، وہ کہہ رہی تھی کہ ابا واپسی پر چولستان سے پیلوں لے کر آنا کیونکہ پیلوں صرف چولستان کی جھاڑیوں میں اُگتے ہیں۔ اب منصور مہان کو کوئی کیا بتاتا کہ اب ہمارے بس میں کچھ نہیں رہا۔ یہ سب مقدر کی بات ہے کہ ہرن کا شکار کرنے نکلے اور ہم خود شکار ہو رہے ہیں۔

اب ہم میں سے شاید سب یک زبان ہو کر بولے کہ امام بخش ہم تو سانس روکے بیٹھے ہیں، آپ بیان نہ روکو...... بولو۔

کیا بولوں ہماری موت تو ریت پر درج ہو چکی تھی اور ہمیں موت کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس لیے ہم نہ موت کا سوچ رہے تھے نہ زندگی کو سمجھ رہے تھے۔ جسم آہستہ آہستہ ریت

کی طرح ہماری مٹھی سے نکل رہا تھا۔ اب سوچتا ہوں انسان میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔

"وہ کیسے؟" سب نے پوچھا۔

"وہ ایسے کہ چھ دن، چھ راتیں شاید گنتی کا پتہ نہیں مگر ایسا لگتا ہے کہ اوپر آسمان تھا، آنکھیں آدھی کھلی آدھی بند تھیں۔ روح اور جسم کا رشتہ اپنی آخری حد پر آ چکا تھا جو میں محسوس کر سکتا تھا، وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ اُس وقت بے بسی کی وجہ سے ہم سب کسی رشتے میں نہیں تھے۔ بس زندہ لاشیں پڑی تھیں، مسئلہ موت سے ملنے کا نہیں تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس کیفیت میں بندہ کیا سوچ سکتا ہے۔ کیا اُس کی اوقات ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ وہ کوئی فلسفہ کوئی ادبی تخیل کوئی شاعری، کوئی گیان دھیان دے سکتا ہے۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔" امام بخش ہمت ہار گیا تھا۔ بہت سے لمحے خاموش گزرے اور پھر آنسو پونچھتے ہوئے اندر کو دبی ہوئی آواز میں بولا۔

"ایک وقت آیا جب ایسے لگا عالم برزخ ہے۔ کچھ آس پاس نہیں۔ آنکھوں میں بے شمار سراب تیرنے لگے۔ طرح طرح کی لہریں، طرح طرح کے منظر آگے پیچھے ہو رہے تھے۔ مجھے احساس نہیں تھا کہ میں ہوں۔ بس میں تیر رہا ہوں۔ بینائی میں ریت تو آ ہی گئی تھی، غنودگی بھی آ گئی جو مرنے سے پہلے انسان کی آنکھیں مندنے لگتی ہیں اور جسمانی تکلیف کی بجائے روح کی پھڑ پھڑاہٹ والا مرحلہ ہوتا ہے۔ میں نہیں جانتا تھا۔ باقی کہاں ہیں۔ حلیم خان اور دوسرے کس حال میں ہیں۔ اندر سے پانی خشک ہونے کے بعد آواز کی سکت تو کب کی جا چکی تھی۔ جسم کیا تھا، ریت کی ڈھیری تھا۔ اب وقت کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ صبح دوپہر، سہ پہر، شام، رات کچھ بھی ذہنی، جذباتی اور جسمانی طور پر میرے لیے موجود نہیں تھے۔ دن سفید کاغذ، رات سیاہ کاغذ، زمین اور آسمان جیسے مجھے اپنے دباؤ میں لے رہے ہیں۔ میں نے بالآخر آنکھیں موند لیں۔ اب مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں زندہ ہوں یا نہیں ہوں۔ سب کچھ بے معنی ہو چکا تھا۔ کسی بھی قسم کا احساس میرے اندر موجود نہیں تھا۔

ایک لمحے کو میں اگر جھرجھری لیتا تو وہ سب اضطراری ہوتا۔ اب میں تقریباً مر چکا تھا۔ کم سے کم اپنی حد تک تو مر چکا تھا۔ مرنے کا احساس مجھے نہیں تھا۔ بس یوں کہ یادداشت چلی گئی۔ Time and Space سے باہر ہو گیا۔ پھر نہیں معلوم کیا ہوا۔ بالکل ایسے جیسے مریض کو آپریشن سے پہلے بے ہوش کیا جاتا ہے تو اسے نہیں پتہ ہوتا وہ کہاں گیا اور پھر اسے بیدار کیا جاتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ مجھے بھی پتہ اُس وقت چلا جب وکٹوریہ ہسپتال بہاولپور میں مجھے ڈاکٹر نے جگایا۔ مجھے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو معلوم ہوا میں ہوں۔ پھر مجھے بہت دیر لگی، یہ معلوم کرنے میں کہ میں یہاں کیوں ہوں۔ میں زندہ کیوں ہوں۔ کیا میں مر گیا تھا۔ کیا میں پھر سے زندہ ہوا ہوں۔ بس اتنا احساس تھا کہ میں بستر پر سانس لے رہا ہوں۔''

''تو امام بخش کسی نے تمہیں وہاں سے ریسکیو کیا؟ مطلب بچانے کے لیے کون آیا؟'' ہم میں سے کوئی بولا۔

''یہ جو بھی آیا تھا، جس کے گلے مل کر میں رویا۔ وہ بخشندہ تھا جس نے مجھے وہاں سے اٹھایا۔ ہُوا یہ کہ سب کو پتہ چل گیا کہ ایک پارٹی گم ہو گئی ہے۔ اب آگے نہیں معلوم۔ کچھ تم بھی زور لگا لو'' یہاں امام بخش خاموش ہو گیا مگر کہانی خاموش نہیں ہوئی۔ معلوم پڑا کہ جب یہ دو جیپوں کے مسافر چولستان کے ریڈار سے غائب ہوئے تو مقامی باشندوں اور انتظامیہ کی جانب سے تشویش پھیلی اور جب کوئی سراغ نہ ملا تو چولستانی انتظامیہ نے مقامی لوگوں سے مل کر ٹیمیں ترتیب دیں اور پھر ایک ٹیم نے وہاں پر پہنچ کر دیکھا تو تونسوی، منصور مہان اور ڈرائیور کے ساتھ حلیم خان تو ریت میں دب کر کب کے خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ صرف امام بخش کی سانس چل رہی تھی ویسے مرنے کو وہ بھی مر گیا تھا۔ اب یہ ہوا کہ جس کی سانس چل رہی تھی اُسے آکسیجن لگائی گئی کہ اس کا انتظام تو کیا جا چکا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ حلیم خان، تونسوی اور منصور مہان زندہ ہیں اور ڈرائیور بھی زندہ ہے یا

مجھے کسی نے کیا بتانا تھا۔ میں آہستہ آہستہ جب دیکھنے کے قابل ہوا تو لگا یہ کوئی نہیں...... غنودگی کا خواب تھا اور اس خواب میں مجھے بہت کچھ دکھائی دیا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ مجھے محسوس ہوا۔ میں تاریخ میں بہت پیچھے چلا گیا ہوں۔ میں دریائے ہاکڑا یا سرسوتی کے کنارے لیٹا ہوں۔ دریا خشک ہوتے ہوتے بس ایک آخری قطرے کے کنارے آ چکا ہے۔ پوری بستی آہستہ آہستہ مر رہی ہے۔ دونوں کناروں پر بچوں، بڑوں، عورتوں اور بزرگوں کے جسم لاغر ہو کر گرے ہیں۔ سب ایک دوسرے کے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ آسمان پر گِدھ منڈلا رہے ہیں اور گِدھ ہر اُس لاش پر اُترتے ہیں جو چند لمحے پہلے دم توڑ جاتا ہے۔ میں گِدھوں کو دیکھ رہا ہوں۔ گِدھ عجیب پرندہ ہے جس سے سب نفرت کرتے ہیں مگر اُس لمحے مجھے گِدھ ایک خوبصورت پرندہ لگنے لگا جو دھرتی کا خاکروب ہے۔ جو زمین کو صاف رکھتا ہے جو بدبو غائب کرنے کے لیے ساری بدبو اپنے اندر لے جاتا ہے۔ وہ پرندہ مجھے دکھائی دیا اور میری خواہش تھی کہ وہ آ جائے اور پہلے میری آنکھیں کھائے۔ پھر میرے جسم کو نوچ نوچ کے زمین سے اُٹھا لے۔ میں نے محسوس کیا کہ دریا آہستہ آہستہ خشک ہو رہا ہے۔ لوگ دُہائی دے رہے ہیں۔ چولستان کے اطراف میں بھاگ رہے ہیں۔ کچھ گر رہے ہیں۔ کچھ آخری سانس لے رہے ہیں۔ دریائے ہاکڑا اب خشک ہو چکا ہے۔ بستی خالی ہو چکی ہے۔ محبت کرنے والے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے موت کو گلے لگا چکے ہیں۔ محبت کی آس میں محبوبہ کو تلاش کرنے والے ایک ہاتھ کے فاصلے پر اپنی محبوبہ کے قریب گر چکے ہیں اور صرف ملنے کی حسرت اُن کے بیچ میں موجود ہے اور میں دیکھ رہا ہوں۔ گویا میں نے دریائے ہاکڑا اور سرسوتی کو سوکھتے دیکھا ہے اور آہستہ آہستہ سورج کا اٹھنا اور پھر غروب ہونا اور پھر رات کے بعد پَو پھٹنا اور پھر سورج کا اٹھنا اور پھر غروب ہونا۔ یہ سب رنگ میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں نے دریائے ہاکڑا کو سوکھتے ہوئے دیکھا ہے اور میں آخری آدمی ہوں جو اس آخری نظارے کا گواہ ہے کہ سب سمتوں میں موت نے

اپنا راج نافذ کر دیا ہے۔ صرف میں ہوں جو موت کی دسترس سے ابھی باہر ہوں اور میں بس خواب ہی میں دیکھ رہا تھا کہ میں ہزاروں سال پیچھے پہنچ گیا ہوں اور وہ تجربہ لے رہا ہوں جو کبھی کسی آخری آدمی نے ہاکڑا اور سرسوتی کے کنارے حاصل کیا ہوگا۔ گویا میں دو جنم دیکھ آیا ہوں۔"

اب تو سب نے امام بخش کو ایک اور نظر سے دیکھا کہ اینٹیک آدمی معلوم نہیں حقیقت میں زندہ بھی ہے کہ نہیں ہے مگر امام بخش سامنے بیٹھا تھا۔ ہم سب امام بخش کو سُن رہے تھے۔ وہ ازل سے کہانی کار تھا اور ہم کہانی کے بھگت تھے جو شہر کے چائے خانوں میں مارے مارے پھرتے تھے۔ پرانے شہر کی قدیمی روایات کا پالن تو ادیب، شاعر، مصور، فلسفی اور رقاص ہی کر سکتے ہیں۔ ہاں بھول گیا مجسمہ ساز بھی اُس شہر کے باطن میں موجود تھے کہ اس شہر میں بتوں کو بنانے اور پوجنے والوں کی ایک تاریخ دفن تھی اور تاریخ دفن نہیں ہوا کرتی۔ تاریخ دفن حقیقت کو اُجاگر کیا کرتی ہے اور ایسا ہی اُس وقت ہو رہا تھا۔ امام بخش کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ زندہ ہے اور وہ چولستان کی ریت پر نو دس دن اور راتیں ایک خواب میں گزار کر آیا ہے۔ اگرچہ کئی دن ہسپتال میں رہنے کے بعد وہ ہم میں بیٹھا تھا لیکن لگتا تھا وہ ہمارے سامنے نہیں بیٹھا، وہ کہیں بہت دور سے ہزاروں سال پیچھے سے سرسوتی کے سوکھتے کنارے سے بول رہا ہے۔ اب کہنے کو تو اُس کی واردات ہم نے سن لی تھی۔ اب امام بخش کہیں کھو گیا اور یہ محفل اپنی شمعیں بجھا کر رخصت ہوگئی۔

ہم سب چائے خانوں، ادبی بیٹھکوں اور دوستوں کی محفلوں میں کتنی بار ملے۔ امام بخش نہ آیا۔ ہم نے بھی سوچا کہ یا تو امام بخش کی یادداشت جواب دے گئی ہے یا وہ اس بڑے تجربے کے بعد ابھی کئی صدیوں کے تانے بانے میں پھنسا ہوا ہے۔ ایک قصہ گو کی کئی مجبوریاں ہوتی ہیں، وہ جب ایک قصے میں الجھتا ہے تو اگلا قصہ اُسے پکڑ لیتا ہے اور وہ اس طرح کئی قصوں میں گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ اس لیے امام بخش کو سب نے معاف کر دیا کہ وہ

کیوں نہیں آیا مگر ایک شام جب ہم سب کچے پکے انقلابی اور نیم افسانہ نگار اور نیم شاعر قسم کے لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر یاد کرنے لگے کہ اب نیا قصہ کون سنائے گا کہ الاؤ جل رہا ہے اور قصہ گو موجود نہیں ہے کہ اچانک سب نے دیکھا کہ امام بخش داخل ہوا۔ الاؤ بجھنے والا تھا مگر وہ آ گیا۔ آ کر بیٹھا اور کہنے لگا کہ وہ اپنے حجرے میں تنگ پڑ گیا تھا۔ وہاں میرے پاس کچھ بھی کام ایسا نہیں تھا کہ میں اُس قصے میں گم ہو جاؤں کہ قصہ آپ سے گم ہونے کا پروانہ مانگتا ہے۔ جب ایسا نہ ہوا تو میں یہاں آ گیا ہوں۔ اب سب کے اندر امید کی لَو جاگی کہ کچھ اور سامنے آنے والا ہے اور امام بخش کے پاس ہمارے لیے کچھ اور کہانی ہے۔ سب دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔ اگرچہ محفل کا چراغ بجھ رہا تھا مگر ابھی لَو باقی تھی۔ ہم میں سے ایک بولا "اماموچاچا آج تمہاری خرجین میں کون سی کہانی ہے؟"

"کہانی کی جڑیں ہوتی ہیں۔ آج ایک جڑ مجھے ملی ہے۔ وہ جو نشاط روڈ کے چکلے کی کہانیاں سُنائی تھیں۔ ان میں سے ایک جڑ نے زمین پکڑ لی ہے اور وہ کہانی کسی کوٹھے پر جوان ہو گئی ہے۔ آج ایک بزرگ عورت راستہ پوچھتی میرے چوبارے پر آئی۔ بھلا رنگ روپ تھا۔ سفید چادر میں بڑھاپا ڈھانپے ہوئے، آ کر بیٹھ گئی۔ میں سمجھا کسی بڑے جاگیردار کی حویلی سے آئی ہے اور اسے مجھ سے کوئی راز کی بات کرنی ہے۔ بات تو راز ہی کی تھی مگر وہ جاگیرداروں کی کسی حویلی سے نہیں آئی تھی بلکہ نشاط روڈ کے ایک کوٹھے سے آئی تھی۔"

"پھر کیا ہوا؟" ظاہر ہے سب کے منہ میں رال پیدا ہو گئی۔

بس تو وہ دایہ کہ بہت سے کوٹھوں کی سُن گُن رکھتی تھی اور اپنے علاقے کی پوری روایات میں گُندھی ہوئی تھی، وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی تھی۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ ذرا وہ پسر گئی اور مجھ سے لگاوٹ میں بولیں کہ آپ کا پتہ بی بی کو مشکل سے ملا ہے۔ وہ ہے ناں کہ نام کوٹھوں چڑھ جاتا ہے تو آپ کا نام بھی کوٹھوں چڑھ گیا ہے۔ اب مجھے پتہ چلا کہ میں کوٹھوں کا کہانی کار بن چکا ہوں۔ گویا میں مرزا ہادی حسن رُسوا کا دوسرا ایڈیشن ہوں جو اس شہر میں

پیدا ہو چکا ہے۔ اب میں بھی کوٹھوں چڑھا تو سیدھا اُسی کوٹھے پر سیڑھیاں چڑھ کے پہنچ گیا جہاں اُس دایہ نے اپنی بی بی کا بتایا تھا۔ اب ایسا تھا کہ میں جا کر بیٹھ گیا اور دایہ نے کورنش بجا لانے کے بعد کہا کہ بی بی تشریف لاتی ہیں مگر وہ تشریف نہ لائیں اور ایک خواجہ سرا قسم کا لڑکا جسم کو لچکاتا ہوا آیا، ہاتھ میں شربت کا گلاس تھا اور بولا "آپ ہماری بی بی کے مہمان ہیں تو یہ تو انہوں نے تاکید سے بھیجا ہے، لے لیں۔"

میں نے وہ گلاس لے لیا۔ اب مجھے کچھ بھی پتہ نہیں تھا کہ ایک تاریخ کے کیڑے سے وہ بی بی کیا کام لینا چاہتی ہے۔ پھر بھی میں وہاں چلا گیا اور میں سوچنے لگا کہ تاریخ کا کیڑا تو زمانے کو کُتر کر اپنے لیے لباس بنا سکتا ہے تو اب وہ بی بی مجھ سے کیا کام لینا چاہتی ہے۔ بس صرف اتنا سمجھ میں آیا کہ وہ بی بی اپنی کہانی ایک تاریخ دان کے پاس ریکارڈ کرانا چاہتی ہے تاکہ وہ سینہ بہ سینہ زندہ رہے۔ گویا میں مرزا ہادی حسین رُسوا تھا اور وہ شاید امراؤ جان ادا تھی کہ اُس کا حسب نسب بھی اچھے گھر کا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ مجھے بتائے کہ میں کیسے اس چکلے تک پہنچی۔ یہاں آ کر امام بخش رُکا اور ایک بے حد پتے کی بات بتائی۔

"یہ جو چکلہ اور بالا خانہ ہوتا ہے دونوں میں بہت فرق ہے۔"

"پھر تو بازارِ حسن اور کوٹھے میں بھی فرق ہوگا۔" ایک نووارد پنچھی کہ محفل میں پیچھے بیٹھا تھا، چونچ کھولتے ہوئے بولا۔

"ہاں تو یہ فرق میں بتاتا ہوں۔ چکلہ وہ ہے جہاں جسم کے بیوپاری آتے ہیں اور جسم کے دھندے کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ مثلاً ایسے کہ مشہور انگریزی کے ادیب خوشنونت سنگھ نے اپنی زندگی کی روداد لکھتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ وہ لندن اپنی پہلی ملازمت کے لیے بحری جہاز سے بمبئی سے جا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ جہاز رات کو نو بجے جائے گا تو اس بیچ تین گھنٹے تھے تو سوچا ذرا چکلے میں اپنی جوانی کا سکہ بجایا جائے۔ سو وہ بمبئی میں ایک ایسے علاقے میں جا پہنچے جہاں دھندہ جھونپڑ پٹی میں کہیں ہوتا تھا۔ ناواقف ہونے کی وجہ سے سنگھ

صاحب وہاں جا پہنچے تو انہیں سعادت حسن منٹو کے ایک افسانے کی گھاٹن یاد آ گئی جس کا رنگ مُشکی سانولا تھا مگر جسم کے خطوط اُبھرے اُبھرے تھے اور اُس کھولی میں پھٹا ہوا پردہ لگا تھا اور سنگھ صاحب نے اپنی زندگی میں جنسی تجربے کا شاید دوسرا تجربہ کیا مگر جب باہر آئے تو محسوس ہوا کہ انہوں نے کسی کی عزت لوٹی ہے اور لذت بھی اُن کا مقدر نہیں بنی۔" یہاں امام بخش نے بیان روکا تو محفل میں ایک نابغۂ جنسی معلومات تشریف فرما تھا، اُس نے عجب واقعہ سنایا کہ کہانی کے امام جناب امام بخش اس سے ملتا جلتا واقعہ میرے ساتھ ہوا ہے کہ میں اپنے دوست محمد نواز کی دعوت پر دبئی میں گیا۔ وہ وہاں الیکٹریشن ہے۔ پاکستانی مزدوروں کی ایک آبادی انہوں نے دنیا کے رئیسوں کی جنت کے بالکل بازو میں ایسے آباد کی ہے جیسے بڑے شہروں کی رہائشی سکیموں میں گندے پانی کی بدرو ہوتی ہے تو مجھے محمد نواز ایک شام دل پشوری کرنے کے لیے ایک تین منزلہ زیرِ تعمیر عمارت کے ڈھانچے میں لے گیا جہاں ایک چکلہ آباد تھا۔ کھردری سیڑھیوں سے اوپر جا کر دیکھا کہ کمروں کے ڈھانچے کھڑے ہیں اور ان پر پردے کے لیے چادریں لگائی گئی ہیں۔ ایک پردہ اٹھا کر اندر گئے تو ہم صرف دو لوگ تھے۔ دیکھا کہ زمین پر بچے لڑکے بڑے کوئی پندرہ کے قریب لوگ بیٹھے ایک بڑے تسلے میں بنے چاول کھا رہے تھے۔ ان میں دو تین عورتیں ایسی تھیں جن کی وجہ سے یہ ایک کمرہ چل رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اُن کے مردوں کے ہاتھ منہ تک آتے آتے رُک گئے۔ محمد نواز نے کہا، ہم انتظار کرتے ہیں۔ آپ کھانا کھا لیں مگر وہ بولے، کوئی بات نہیں۔ پردے کے اس طرف انتظار کریں، ہاتھ دھو کر آپ کے لیے ہماری لڑکی آتی ہے۔

جب میں نے یہ سب دیکھا تو مجھے جیسے اندر سے اُبکائی آئی اور میں باہر چلا گیا۔ میں یہ سب نہ تو جانتا تھا نہ اس کی کوئی تصویر میری توقع میں تھی۔ غربت کے اس نظارے کے بعد صرف ایک معمولی چادر کے پیچھے میں ایک بھوکی لڑکی کو جو ابھی کھانے سے فارغ ہوئی ہو، کیسے اپنی جنسی تسلی کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ مجھے لگا، میں شاید ایک بھوکی بلی کا ریپ کروں

گا۔ میں نے وہاں سے دوڑ لگا دی لیکن محمد نواز نے مجھے کہا کہ بھائی جان اُن کی ضرورت وہ چند درہم تھے جن سے ان کے دو دن یا تین دن گزر جانے تھے۔تم نے وہ بھی مروا دیئے۔ میں نے اُس پر اُس سے کہا کہ تم یہ درہم انہیں ابھی دے کر آؤ تو وہ بولا، میں تمہارے کہنے سے پہلے ہی دے آیا ہوں کہ جب آپ وہاں پہنچ کر لڑکی کا چناؤ کر لیتے ہیں تو جانور دیکھنے کی بھی فیس ہوتی ہے......تم سمجھ گئے ہو گے۔

جب یہ بات سامنے آئی تو امام بخش نے سب کی طرف دیکھا اور گویا ہوا کہ تم سب نے اپنی اپنی واردات بتا دی جو میں سمجھ سکتا ہوں۔اب میرا بیان قابل قبول ہے کہ نہیں۔سب نے اسے قابل قبول قرار دیا اور امام بخش گویا ہوا کہ ''داستان اپنا راستہ خود طے کرتی ہے تو پھر تم سنو، میں مرزا ہادی حسین رُسوا نہیں ہوں مگر میں اُسی کا ڈبل رول کر رہا ہوں۔''

''تو پھر وہ جس نے آپ کو کوٹھے یا بالا خانے پر بلایا تھا،وہ کیا کہنا چاہتی تھی؟''

''ہاں کوٹھے اور بالا خانے میں وہی فرق ہے جو ڈیفنس کی کوٹھی اور اندرون شہر کے کسی گھر میں ہوتا ہے۔''

''یعنی بالا خانہ ڈیفنس کی کوٹھی اور کوٹھا کوئی پانچ مرلے کا مکان؟''

''ہاں یہی سمجھو۔مگر یہاں رُکو میں کہانی کو روکتا ہوں کہ میں کہانی کو روک سکتا ہوں۔''

اب سب پھر سے خاموش ہو گئے کہ ایک نئی کہانی کا سرا نکل آیا تھا......امام بخش اب ایک نیا پینترا بدل کر آ گیا تھا۔

''سنو صاحبو۔عورت ہمیشہ مرد کی تفریح کا سامان رہی ہے لیکن مرد کو یہ معلوم نہیں کہ عورت مرد کی سب سے بڑی پارکھ ہے۔مرد لاکھوں پردوں میں چھپ کر بھی عورت کے سامنے الف ننگا ہوتا ہے اور وہ ان پردوں سے ہی اندازہ لگا لیتی ہے کہ مرد کتنے پانی میں

ہے۔مرد کی سرشت میں جھوٹ اور فریب شامل ہے۔وہ سمجھتا ہے عورت کے سامنے مودب بن کر اور اُس کی عزت کا ڈرامہ رچا کر وہ عورت کا دل جیت لے گا، ہرگز نہیں۔عورت اُس کی جھکی نظروں کے اندر اس کی بدمعاشی کو بھانپ سکتی ہے۔مرد کی ایک نگاہ اُس کو عورت پر عریاں کر دیتی ہے اس لیے کہ مرد اپنی فطرت میں عورت کو صرف ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے کہ اُس کے جسم کا گداز اور ابھار کس طرح اُس کے بازوؤں میں سما سکتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ قدرت نے مرد کو بہت ہی ادھورا بنایا ہے۔اُس کے بس میں کم ہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے جنسی دباؤ کو اپنی سانسوں کے ذریعے اپنے قابو میں رکھ سکے۔اس لیے جہاں مرد ختم ہوتا ہے وہاں سے عورت شروع ہوتی ہے۔کبھی مرد نے عورت سے پوچھا تیری اتھاہ گہرائی کہاں ہے۔اس جنسی کنٹریکٹ میں تیرے حصے میں کیا آیا؟"

"لیکن امام بخش آپ کو تو پتہ ہے کہ ہمارے شہر میں حاذق حکیموں حکماء الحکماء جالینوسوں جنسی علاج کے ماہرین اور قوتِ باہ کے ساتھ قوتِ نباہ کے نسخوں کُشتوں، خفیہ امراض اور معالجوں کی دکانیں قطار اندر قطار موجود ہیں اور پھر بڑے بڑے جاگیرداروں، رئیسوں، تاجروں، نو دولتیوں اور سجادہ نشینوں کے ساتھ علمائے کرام سے ہوتے ہوئے مولویانِ عظام تک سب ان حکیموں کے محتاج ہیں۔یہ عجیب شہر ہے، شہر ہے کیا؟ تاریخ کے بطن سے پیدا ہونے والا یہ شہر بڑی بڑی حویلیوں، بڑی کوٹھیوں، باغات اور مضافاتی آبادیوں میں پھیلا ہوا ہے۔حیرت ہے صاحبو کہ ایک دن میں نے ان طبیبوں، معالجوں، حکیموں، سند یافتہ خاندانی دواسازوں اور جنسی کمزوریوں کا تیر بہدف علاج کرنے والوں کے بازاروں کا جائزہ لیا تو آپ کو یقین نہیں آئے گا۔اس چھوٹے سے شہر میں بارہ بازار حکیماں وطبیباں موجود ہیں۔چھوٹے موٹے دکاندار جو دوسرے بازاروں میں موجود ہیں، وہ الگ سے ہیں اور سب کے سب ایک ہی سودا بیچتے ہیں تو ایسے میں صرف چکلے ہی آباد نہیں ہوتے کوٹھیوں حویلیوں، غلام گردشوں اور چوباروں کی چولیں بھی ہلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

اب ذرا ان کی خاندانی توصیف بھی ہو جائے جو خاندانی طبیب و حکیم ہیں ان کے باپ دادا ہندوستان کے کسی نہ کسی راجواڑے سے منسلک تھے۔ کلکتہ سے راجکماری تک ان کے نسخے اور جڑی بوٹیاں اور مقوی ادویات سے حلوہ جات تک اور خمیروں سے کُشتوں اور عرقیات سے جوارش مراوید کے معجونوں تک بے حد مقبول تھے۔ ان میں خاندانی حکیموں کی آخری نسل اپنے بزرگوں کے بتائے ہوئے اصولوں اور راستوں پر چل رہی تھی۔ ہر روز صبح سفید دُھلے کپڑوں میں نہا دھو کر اپنے مطب میں چوکی لگا کے براجمان ہونا اور شاگردوں کو بھی صفائی ستھرائی کے ساتھ ہاون دستے پر لگانا۔ کسی کو پڑیاں بنانے اور کسی کو چاندی کے ورق کوٹنے پر لگانا تو گویا معمول تھا۔ ان خاندانی طبیبوں میں کچھ اضافی تخلیقی صلاحیتیں بھی ورثے میں ملی ہوئی تھیں۔ اکثر حافظِ قرآن کے ساتھ شاعر بھی تھے۔ کچھ تو فلسفے اور علم الکلام میں بھی درک رکھتے تھے اور بعضے تو با قاعدہ قصہ گو تھے۔ یہ چلن پچھلی صدی سے چلا آتا تھا۔ پھر یہ کہ ان کے مطب یا دکانوں پر کیا کیا بِکتا تھا، یہ ایک عجب کہانی ہے۔ اس کا تجزیہ کوئی پنساری، کوئی کریانہ فروش یا کوئی پرچون فروش نہیں کر سکتا تھا۔

''مطلب کیا کچھ مختلف بِکتا تھا وہاں؟'' ہمت کر کے ایک سامع بولا۔

''ہاں ٹھیک پوچھا۔ اب اگر سمجھ سکو تو جانو کہ کیا نہیں بِکتا تھا۔''

''ہاں یہی تو پوچھ رہے ہیں۔''

''تو سُنو۔ وہاں دیسی گھی بِکتا تھا۔ جو شہر میں سب سے زیادہ خالص تصور کیا جاتا تھا۔ وہ آلو سے نہیں بھینسوں کے دودھ سے بنایا جاتا تھا اور ہر کوٹھی، حویلی اور گھر سے برتن آتے تھے۔ اب اور سنو انتہائی گرم موسم کا شہر ہے تو گرمی اوپر کی بھی تھی اور اندر کی بھی تھی اور ساری بھڑاس اس عورت پر اُترتی تھی۔ چاہے وہ بیوی ہو یا رکھیل ہو یا کچھ نہ ملے تو لڑکا ہو۔ لڑکا بھی نہ ملے تو گدھی ہو۔ گدھی نہ ملے تو بھیڑ ہو۔''

یہ ساری باتیں سب جانتے تھے مگر بول کوئی نہیں رہا تھا کہ پھر سے امام بخش نے

بیان جاری کیا کہ دیسی گھی کے بعد ہر طرح کے شربت وہاں موجود ہوتے تھے۔ شربت فولاد، شربت گلاب، شربت صندل، شربت فالسہ، شربت خس خس، شربت بادام، شربت الائچی، شربت شہتوت اور شربت انار تو بوتلوں میں بھرے رہتے تھے کہ اِدھر گاہک آیا اور اُدھر اُسے دے دیا۔ ہاں کچھ فرمائشی شربت بھی بنائے جاتے تھے۔ مثلاً شربت دل جانی، شربت نو بہار، شربت رات کا رس، شربت عشق پیچاں، شربت رات کی رانی وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد جملہ اقسام کے عرقیات، خس خس کے عرق سے لے کر عرقِ سونف تک درجنوں کی تعداد میں قطار اندر قطار رنگ برنگی بوتلوں میں اپنے ٹریڈ مارک کے ساتھ موجود ہوتی تھیں۔ اس کے بعد مرتبانوں کی عمل داری ہوتی تھی۔ جملہ اقسام کے مربہ جات از قسم ہڑ ہڑ کا مربہ، کریلے کا مربہ سے لے کر آملہ اور بہیڑوں کے مربوں تک مقوی اور تیر بہدف قسم کے مربے لذتِ کام و دہن کے ساتھ لذتِ بدن تک کے لیے موزوں تصور کیے جاتے تھے۔

اب جڑی بوٹیوں کی تفصیل بھی سن لیں، پورے ہندوستان کے پہاڑوں سے لے کر صحراؤں تک کی خاک چھان کر جڑی بوٹیاں جمع کی گئی تھیں۔ چولستان اور تھر کے صحراؤں سے لے کر شمالی علاقوں کی وادیوں، گھاٹیوں اور برفوں میں دبی ہوئی جڑی بوٹیوں کو ماہرین پوری پہچان سے لے کر آتے تھے اور پھر یہ حکماء، طبیب اور ماہرین نباتات اُن کی تفہیم کے ساتھ ان پر تجربات کرتے تھے۔ کس قسم کے تجربات؟ قوتِ باہ کی آزمائش سے لے کر تپ محرقہ تک انسانی جسم کی اناٹومی اُن کے لیے ایک امتحان ہوتی تھی۔ نزلے اور زکام کی بیسیوں اقسام کے لیے الگ الگ نسخے موجود تھے اور ہر حکیم ہر بیماری کی جڑ نزلے کو قرار دیتا تھا۔ گویا نزلہ ہمیشہ نزلے پر گرتا تھا۔ نبض دیکھ کر علاج کرنے والے مریض کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس کی خواہشات کی تاریخ معلوم کرنے کے بعد دوا کا فیصلہ فرماتے تھے۔ یہاں ان کی قوتِ بیان فلسفے تاریخ اور نفسیات تک پھیلی ہوتی تھی۔ ان میں سے اکثر شرعی داڑھی اور عمامہ میں دکھائی دیتے تھے۔ ان کی خاندانی نسبت مغلوں سے لے

کر افغانوں اور وسطی ایشیائی علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ عام طور پر یہ خوبصورت مردوں میں شمار ہوتے تھے اور مرد تو وہ ویسے بھی تھے کہ ان کے پاس خاندانی نسخوں اور ٹوٹکوں کے خزینے موجود تھے جو کُشتوں اور مقوی گولیوں کی شکل میں ڈبیوں میں تیار ملتے تھے۔ مقوی گولیاں چاندی کے ورقوں میں لپٹی ہوتی تھیں اور دودھ کے علاوہ بادام کے شربت کے ساتھ بھی لی جاسکتی تھیں۔ جہاں تک کُشتوں کا تعلق ہے تو وہ بے حد خفیہ قسم کے نسخوں کا ایک ایگریمنٹ (سمجھوتہ) ہوتا ہے۔ اُس کے ساتھ جو اُس کُشتے کے لیے خود کو پیش کرتا ہے۔ اب آج کی دنیا میں کُشتوں کے لیے ایک دوائی ایجاد ہو چکی ہے جسے گزشتہ پچیس سالوں سے ویاگرا کہتے ہیں اور اسی ویاگرا نے قیامت ڈھا دی ہے لیکن سنا ہے کہ کُشتوں کے آگے ویاگرا کچھ نہیں بیچتی۔ بہر حال یہ احوال سنانا ضروری تھا صاحبو......

اب صاحب لوگ تو چائے خانے میں امام بخش کے بیان کے سامنے بالکل ساکت وصامت ہو گئے۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ آخر کو تو قصہ گو کی یہی پہچان ہے کہ سننے والوں کے بدن میں لہو جم جاتا ہے تو ایسا ہی کچھ ہو گیا۔ پھر امام بخش نے انہیں جگایا کہ صاحبو! اب میں نے جو بتایا اُس کے نتیجے میں جو کچھ میرے ساتھ ہوا وہ بھی سنو......اور یہ واقعہ مجھے ایک حاذقِ دوراں حکیم انعام اللہ خان آشفتہ نے سنایا تھا کہ آشفتہ اُن کا تخلص تھا۔ وہ شعر فرماتے تھے۔ حکیم مومن خان مومن اُن کے آباؤ اجداد میں کہیں بسرام کرتے تھے تو خیر آشفتہ صاحب کا قصہ بھی بہت عجیب ہے۔ کیا سنو گے؟

چائے خانے میں اونگھتے ہوئے سبھی چوکنے ہو گئے اور دوزانو ہو کر بیٹھ گئے کہ نیا قصہ آرہا ہے۔ تو ایسے میں امام بخش نے پہلو بدلا اور بولے کہ کیا تم نے قصے میں سے قصے کی خوشبو نہیں سونگھی تو کسی نے بھی اس کا جواب نہ دیا تو پھر امام بخش پر لازم تھا کہ وہ پٹاری کھولے اور اُس نے کھول دی کہ یارو اور صاحبو سنو حکیم انعام اللہ خان آشفتہ ایک نواب کے ذاتی معالج اور ان کے جنسی معاملات کی دیکھ ریکھ کرتے تھے۔ نواب صاحب بھی

قیامت کی نظر رکھتے تھے۔ خاندانی بیگم کے بعد ایک چُن کے چندے آفتاب چندے ماہتاب قسم کی لڑکی کو کسی شادی کی تقریب میں دیکھا جو خاندان میں ہو رہی تھی...... وہ لڑکی کسی سہیلی کے ساتھ آئی تھی جو انہی کے خاندان سے تھی۔ نواب صاحب افغانی رنگ روپ اور بڑی جاگیر کے ساتھ نک سک سے درست تھے تو لڑکی تک پیغام گیا۔ لڑکی کے والدین نے سوچا اور پھر معاملہ لڑکی پر چھوڑ دیا۔ لڑکی نے سوچا کہ اپنے طبقے کے کسی نوکری پیشہ لڑکے کو چُن بھی لے گی تو اُسے گاڑی، کوٹھی اور نوکر چاکر لانے میں کم سے کم پندرہ سے بیس سال لگ سکتے ہیں اور یہ نواب تو پلیٹ میں رکھ کے ساری سہولتیں دے رہا ہے تو لڑکی نے والدین سے ضد کر کے نواب سے شادی کا فیصلہ کر دیا کہ آم کے باغوں سے لے کر زمینوں کی وسعت نے لڑکی کو ایک رومانس میں مبتلا کر دیا تھا...... سو لڑکی نواب صاحب کے عقد میں آ گئی۔ مگر قصہ تو کچھ اور ہے......

اب سب چونکے کہ قصہ کے اندر سے ایک نہیں کئی قصے کیسے جنم لے سکتے ہیں مگر امام بخش تو امام بخش تھا۔ کچھ بھی نکال سکتا تھا۔ سو اُس نے کہا:

''نواب صاحب انعام اللہ خان آشفتہ سے نسخے کشتے اور مقوی ادویات لیا کرتے تھے جسے آشفتہ کے خاندان والے سینہ در سینہ سنبھالے ہوئے تھے۔ اب کیا ہوا کہ نواب صاحب کو یہ کشتے اور نسخے یا چاندی کے اوراق میں لگی گولیاں دینے کے لیے خود حکیم صاحب حویلی میں جاتے تھے مگر اب ایک دن کیا ہوا؟''

اب سب کو سانپ سونگھ گیا اور یہ رات کے ایسے پہر کا عمل تھا کہ سب کو نیند نے گھیر لیا تھا۔ ایسے میں ایک بے کار وکیل اور ادھورا شاعر بولا۔ ''اماموا اب بول دے کیا ہوا تھا؟''

امام بخش کو جب تھوڑی سی طاقت ملی تو وہ چائے خانے میں جیسے چہک اٹھا۔ سنو بابولوگو کہانی خود کو کہنا چاہتی ہے۔

سب نے کہا "ہاں کہانی کو بولنا چاہیے۔"

"تو سنو کہانی بولتی ہے......"

"ایک دن حکیم انعام اللہ خان آشفتہ، نواب صاحب کے لیے خاص کُشتے اور قوت باہ کی ادویات لے کر معمول کی حاضری پر پہنچا تو نوکروں، چاکروں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا کہ جانتے تھے کہ حکیم صاحب کا کیا رشتہ ہے نواب صاحب کے ساتھ۔ ڈیرے پر ملاقات کے مخصوص کمرے میں بٹھایا۔ چائے پانی اور حقے پانی کا پوچھا۔ پھر بتایا کہ نواب صاحب تو اچانک شکار پر چلے گئے ہیں۔ وہ دو دن بعد آئیں گے۔ حکیم آشفتہ کو جو انعام اکرام ملنا تھا، وہ تو ملتوی ہو گیا اور وہ جانے کے لیے باہر نکلے کہ ایک دایہ کہ جہاں دیدہ اور خاندانی رازوں کی امین کہ ساتھ اڑتی چڑیا کے پَر گن سکتی تھی، سامنے آئی اور حکیم صاحب سے ادب سے کہا، ہماری چھوٹی ڈیوڑھی آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ حکیم صاحب کو معلوم تھا کہ نوابوں کی پہلی خاندانی بیوی کو بڑی ڈیوڑھی اور دوسری بیوی کو چھوٹی ڈیوڑھی کہا جاتا ہے۔ اب حکیم صاحب سمجھ گئے کہ یہ وہی چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے جس کے لیے نواب صاحب، حکیم صاحب کے خاندانی صدری نسخے کے محتاج ہیں۔ حکیم صاحب نے سمجھا چھوٹی بیگم صاحب کو کوئی بیماری کے حوالے سے مشورہ کرنا ہے تو اُس دایہ کے ساتھ ڈیوڑھی میں چلے گئے۔ اب دایہ کہ جہاں دیدہ اور پیغام رسیدہ تھی، اس لیے وہ کسی اوٹ میں چلی گئی۔ اب چادر میں لپٹی چھوٹی بیگم سامنے آئی اور چہرے سے ہلکا سا نقاب ہٹایا تو حکیم آشفتہ کے جسم میں جھرنے جاری ہو گئے۔ ہوائیں چلنے لگیں اور روح میں بارش جاری ہو گئی۔ تب انہیں معلوم ہوا کہ نواب صاحب کس دیوانگی سے اس کی ادویات پر فریفتہ ہیں۔ اُس حسن دلربا اور نعمت ہوشربا کو دیکھ کر حکیم آشفتہ تو جہاں تھم گئے تھے وہیں تھمے رہے۔ وہ البتہ گویا ہوئی کہ حکیم صاحب آپ ہمارے نواب صاحب کو جو امداد فراہم کرتے ہیں، آپ کو معلوم ہے وہ آرٹلری ہم پر آزمائی جاتی ہے۔ یہ سن کر حکیم صاحب کو ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ پھر

وہ دوسری بیگم حکیم صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تو حکیم صاحب جب آپ کُشتے اور جنسی طاقت کی دوائیں بناتے ہیں تو کیا آپ کے دماغ میں یہ ہوتا ہے کہ یہ استعمال انسانی جسم پر ہوں گی اور انسانی جسم کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ انسان کا اپنا مدافعتی نظام ہوتا ہے۔ انسان کا ایک جسمانی برداشت کا پیمانہ ہوتا ہے اور حکیم صاحب کیا آپ کو کسی خاندانی بزرگ نے نہیں سمجھایا کہ اس طرح کی ادویات جنسی ہوس کار کو دیتے وقت کبھی پوچھتے ہیں کہ جس پر استعمال ہوں گی وہ غریب کس حال میں ہے۔ عورت کو ماہواری بھی آتی ہے اور مہینے کے سات سے آٹھ دن گِنے ہوئے ہوتے ہیں۔ کم سے کم ان دنوں میں تو یہ ادویات نہ دیا کریں...... میری ماہواری کے دن یہ ہیں۔"

ایک کاغذ پر اُس چھوٹی بیگم نے لکھ کر اپنی تاریخیں دے دیں اور پھر وہ چلی گئی۔ اب حکیم صاحب کو کاٹو تو لہو نہیں۔ حکیم صاحب ساکت صامت وہیں زمین میں گڑے رہے۔ یہ تو انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اُن کے نسخوں کا قتیل بھی کوئی ہو سکتا ہے۔ خیر وہ واپس آ گئے اور انہوں نے نواب صاحب کو ان تاریخوں میں ادویات دینا بند کر دیں۔ نواب صاحب نے پوچھا بھی تو حکیم صاحب نے بہانہ بنا دیا کہ جڑی بوٹیاں وقت پر پہاڑوں سے نہیں پہنچیں اور پھر موسم کی مناسبت ضروری ہوتی ہے۔ دھوپ میں کچھ چیزیں سُکھائی جاتی ہیں وغیرہ وغیرہ...... نواب صاحب میں اتنی اہلیت نہیں تھی کہ وہ یہ راز سمجھ پاتے مگر ایک دن......؟

اب سب چونکے کہ ایک نئی کہانی جنم لے رہی ہے۔ سو اُس نے جنم لے لیا۔ وہ یہ کہ ایک دن حکیم صاحب نواب صاحب کے لیے ادویات اور نسخہ جات کے ساتھ مقوی القلوب حلوہ جات اور مربہ جات لے کر گئے تو ان کو اسی طرح عزت آبرو کے ساتھ بٹھایا گیا اور پھر بتایا گیا کہ نواب صاحب کو گورنر صاحب نے طلب کر لیا ہے۔ اس لیے آج وہ آپ کی میزبانی نہیں کر سکیں گے۔ اس طرح حکیم صاحب واپس الٹے پاؤں جانے لگے کہ وہی

دایہ کہ جہاں دیدہ و پیغام رسیدہ قسم کی خاندانی کُٹنی نُما تھی، سامنے آ گئی۔

''حکیم صاحب ہماری چھوٹی ڈیوڑھی نے آپ سے بات کرنی ہے۔ وہ موجود ہیں ڈیوڑھی میں۔''

حکیم صاحب کے من میں تو جل ترنگ بج اٹھی کہ شاید کوئی سُرنگ محل سے دل تک بنا دی گئی ہے۔ وہ جیسے بھادوں کے بادل ہوا میں تیرتے ہیں ایسے ہی تیرتے ہوئے ڈیوڑھی پر آئے۔ اس روز حکیم صاحب نے سفید کُرتا شلوار خالص ملتانی کپاس سے بنا ہوا کہ ملائی جیسا اُس کا فیبرک تھا، زیب تن کیے بالوں کو پیچھے کی طرف آراستہ کیے اپنے خاندانی نقوش اور رنگ و روپ کے ساتھ وہاں پہنچے۔ اب وہ دایہ کہ جس نے برابر التزام کیا ہوتا تھا کہ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔

حکیم صاحب نے قدم رنجہ فرمایا تو چند لمحوں بعد وہ لُعبت ناز اور فرخندہ مزاج بغیر کسی نقاب کے بے نقاب تھی مگر جو مکالمہ ہوا امام بخش کی یادداشت اور قصہ گوئی کا کمال سامنے آ گیا۔ وہ ترچھی چتون سے حکیم صاحب کے سامنے آ گئی۔

''شکریہ حکیم صاحب آپ نے میری بات کا پالن کیا اور نواب صاحب مجھ سے دور رہے۔ ویسے بھی ہم جو چھوٹی ڈیوڑھی ہوتی ہیں، خود کو قانونی طور پر نکاح نامے کے ساتھ اپنے Rape کا حق دے دیتی ہیں۔ یہ ریپ کا لفظ ذرا بہتر ہے جبکہ اصل لفظ زنا ہے۔ ہمارے شوہر ہم سے زنا کرتے ہیں مگر کوئی قانون ان کو پکڑ نہیں سکتا۔''

''مگر اس Rape کے لیے آپ خود ہی تو برضا و رغبت فیصلہ کرتے ہو اور خود کو پیش کرتے ہو۔''

''ہاں ایسا ہی ہے۔ ٹھیک سُنا آپ نے۔''

''تو آپ کو کوئی شکایت ہے زندگی سے؟''

''نہیں تو۔ بس آپ کے سامنے سچ بولا ہے کہ ایک کسبی میں اور ہم میں فرق نہیں

ہے۔بس کسی کی عزت نہیں ہوتی۔ہم یہ عزت لینے کے واسطے نکاح کر لیتی ہیں۔کام وہی ہوتا ہے۔آپ کی دوائیں مردوں کو مردانگی کا یقین دلا دیتی ہیں اور وہ سینہ پُھلا کر ہم جیسی عورتوں کو زیر کر کے اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔''

''محاورے کا خوبصورت استعمال کیا ہے آپ نے۔''

''حکیم صاحب آپ کی بیوی تو ہوگی۔''

''جی۔جی۔ہاں۔وہ ہیں۔بس ایک ہی ہیں۔''

''تو کیا آپ نے یہ مقوی ادویات اور کُشتہ جات اپنی بیوی پر استعمال کی ہیں؟''

''مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

''بہت اعتماد ہے خود پر حکیم صاحب۔آپ سے زیادہ مرد کو کون جانتا ہے جس کے پاؤں کے نیچے ریت ہوتی ہے۔''

''ہاں مگر میں جو حکمت کرتا ہوں، وہ میرا پیشہ ہے۔میری ذاتی ضرورت نہیں ہے۔''

''کبھی تو ضرورت پڑے گی حکیم صاحب۔سنیں جو ادویات آپ نواب صاحب کو دیتے ہیں اس کا بھرم تو مجھے رکھنا ہوتا ہے۔آپ کیا سمجھتے ہیں آپ کی ادویات سے نواب صاحب بڑی دیر تک لذت سے شرابور رہتے ہیں یا وہ مکمل مرد کی صفات کے ساتھ پوری جسمانی قوت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور دیر تک اس میں رہنے کے لالچ میں مبتلا رہتے ہیں......''

''آپ کی بات میں سمجھ رہا ہوں۔مجھے روکنے کا مطلب؟''

''ارے حکیم صاحب آپ ناراض ہو گئے۔آپ کو بہت کچھ بتانا ہے کہ یہ ادویات وغیرہ اور اب تو آپ کو ویاگرا نے مات دے دی ہے۔''

''نہیں چھوٹی ڈیوڑھی نہیں۔اپنے نواب کو اس نئی ایجاد سے دور رکھنا۔وہ کیمیائی

عمل ہے۔ میرے ہاں جڑی بوٹی اور خاندانی نسخوں کے تجربوں سے ادویات اور کُشتہ جات بڑی عرق ریزی سے تیار کیے جاتے ہیں۔ موسموں کا خیال رکھا جاتا ہے اور پھر استعمال کرنے والے کی صحت اور عمر کے حساب سے نسخہ بنایا جاتا ہے۔''

''کیا آپ نسخہ بناتے ہیں نواب صاحب کے لیے؟ آپ کو ان کی عمر کا پتہ ہے۔ مرد کی عمر کا پتہ صرف طوائف یا کسی کو ہوتا ہے کہ اس کی عمر کو انہوں نے برداشت کرنا ہوتا ہے۔''

''آپ جو بھی حکم کریں گی، میں ویسا ہی نسخہ بنا دوں گا۔''

''جانے دیں، پھر کبھی سہی۔ بات کریں گے۔''

''نہیں آپ نے مجھے روکا ہے تو بتائیں کہ میں کیا کروں؟''

''آپ کچھ نہ کریں شلوار اتار کر اندر آئیں اور پھر میں بتا دوں گی کہ آپ کی حکمت کس بھاؤ بکتی ہے......''

اب تو حکیم صاحب کو پسینہ آ گیا اور وہ الٹے پاؤں پلٹے اور مڑ کے نہ دیکھا۔ ویسے حکیم صاحب کا دل للچایا کہ اُس چھوٹی ڈیوڑھی کو کچھ اپنا ہنر اور حکمت کا کرشمہ تو دکھاتے ایسے ہی چیلنج لے کر بھاگ نکلے۔

''تو پھر امام بخش حکیم صاحب کی خواہش پوری ہوئی یا نہیں۔''

''نہ پوچھو حکیم صاحب چھوٹی ڈیوڑھی کے لیے کئی بار نواب صاحب کے ڈیرے پر گئے کہ موقع مل جائے مگر یہ موقع کبھی نہ آیا اور پھر وہ اپنی ادویات اپنی بیوی پر استعمال کرنے لگے اور تصور میں چھوٹی ڈیوڑھی ہوتی تھی۔ یہ بات باریک ہے تم نہیں سمجھ سکو گے۔''

اب رات کے بارہ بج رہے تھے اور کیفے کے معصوم قسم کے غریب بیرے تھک ہار کر بیٹھ چکے تھے۔ ایسے میں کوئی بولا ''امام بخش وہ جس نے چلکے سے آپ کو آواز دی تھی اور آپ یکدم مرزا ہادی رسوا بن گئے تھے، ہم تو اُس قصے کے لیے بیٹھے ہیں، آپ ضمنی قصوں

میں اتنا وقت گزار چکے ہیں۔"

"صاحبو ضمنی قصے اصل قصے کی طاقت ہوتے ہیں اور وہی دراصل درست قصے ہوتے ہیں۔ تمھیں پتہ ہے عدالت میں ایک لفظ ضمنی آتا ہے۔ ضمنیاں ہی اصل ہوتی ہیں تو آپ سمجھ لو کہ میں کیوں آپ کو اِدھر اُدھر بہلا رہا تھا تو پھر حوصلہ ہے تو سنو اصل قصہ آ رہا ہے۔"

اب سب کی نیند ہرن ہوگئی اور سب میر امن کی باغ و بہار کے چار درویش سرنیہواڑے دوزانو ہو کر کفنیاں گلے میں ڈالے قبرستان میں بیٹھے۔ دھواں اُٹھ رہا ہے اور وہ اپنی اپنی کہانی سنانے کے لیے یہاں آ کر بیٹھ گئے ہیں۔ بس ایک فرق یہاں ہے کہ یہ درویش کہانیاں سنانے نہیں، امام بخش سے کہانی سننے کے لیے کفنیاں پہن کے بیٹھے ہیں۔ امام بخش نے انتظار کھینچنے والوں کی دلچسپی دیکھ کر اپنے آپ میں ایک قصہ گوئی کا غرور جگایا اور وہ غرور جاگ اٹھا۔ امام بخش نے اب قصہ گو کا روپ لے لیا اور گویا ہوا۔

"تو صاحبو میں اُس چکلے میں پہنچا جہاں سے مجھے اُس امراؤ جان نے آواز دی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ مقامی امراؤ جان کون ہے اور کیوں مجھ سے اپنی کہانی لکھوانا چاہتی ہے تو میں وہاں پہنچا۔ سیڑھیاں چڑھ کے اوپر گیا تو گویا سیٹ لگا ہوا تھا۔ تماش بینوں کی نشستیں اور سازندوں کے مخصوص مقام کے ساتھ امراؤ جان کا تخت بچھا تھا جس پر وہ براجمان تھی۔ ادائیں تو لبھانے والی تھیں مگر لگتا تھا اداکاری کر رہی ہیں۔ اندر کہیں خاندانی خُوبو ہلکورے لے رہی ہے مگر ٹھسا قائم رکھنے کے لیے پورے تام جھام اور لاؤ لاگ اور ترچھی چتون کی چالبازی کا سہارا لیے ہوئے تھی۔ میں داخل ہوا تو اٹھ کر سواگت کیا۔ سازندوں نے میرے استقبال کا میوزک بجایا۔ مجھے لگا میں امبر سے اترا شہزادہ ہوں۔ پھر وہ نازنین کہ اپنی اداؤں کی سرگم بجاتے ہوئے میری طرف متوجہ ہوئیں۔"

"ہم آپ کے بہت شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہماری دعوت کو عزت بخشی۔ مجھ

ناچیز ہیچمدان کو غرور سے بچایا اور اپنی باندی کا رتبہ بخشا۔ اب میں آپ سے پہلو بہ پہلو بیٹھ کر اپنی زندگی کی داستان بتا سکتی ہوں کہ میں ایک راندہ درگاہ، محفلوں اور درگاہوں کے چراغوں کا دھواں رہ چکی ہوں۔ ایسے میں کون میری کہانی سنے گا۔ آپ تشریف لائے تو من کی مراد پوری ہوئی۔''

اب میری باری تھی تو میں بے تکلفی سے بولا ''مگر جو آپ نے کہا، یہ ماحول تو اُس کے برعکس ہے۔ یہاں تو لگتا ہے ہماری داستانوں کی شہزادی سُرنگ لگا کر اپنے حبشی غلام سے ملنے جاتی ہے اور صبح کی نماز سے پہلے آ جاتی ہے۔ اب فجر کی نماز کا مذکور کیوں ضروری ہے۔ یہ ایک فالتو نکتہ ہے۔''

اس پر وہ جمال زادی اور خوش خصال سرشت گویا ہوئی کہ اے قدیم آستانوں اور مہ خانوں کے قصہ گو کیا تو نہیں جانتا کہ دنیا کا چلن اور رسم ورواج بھی کوئی شے ہوتی ہے جس سے مُنہ نہیں موڑا جا سکتا۔ صدیوں سے ہمارے زمانے جڑے ہوئے ہیں۔ سو میں تو انکساری اور شرمساری کا لبادہ اوڑھ کے کلام کر رہی تھی۔ خیر اب آپ نے شہزادی کے مقام پر فائز کر ہی دیا ہے تو پھر سنیئے میری کیا بپتا ہے۔

امام بخش نے سانس لیا اور محسوس کیا کہ شہزادی نے تو اپنا آپ بجھا دیا ہے، اب قصہ گو کو اپنے دو کانوں اور حافظے کے گھونسلے کی دیکھ بھال کرنی تھی۔ سو امام بخش ہمہ تن گوش اور دوش پوش ہو کر بیٹھ گیا۔ ایسے میں اب اس شہزادی نے اپنی بپتا بیان کی کہ وہ ایک سجادہ نشین مخدوم شاہ قربان علی عرف بہار علی کی بیٹی ہے۔''

یہ سننا تھا کہ تاریخ کھنکھنا کر بول اٹھی کہ اس بالا خانے پر کون آ گئی ہے۔ امام بخش کہ قیافہ شناس اور وقت کا نبض شناس تھا۔ اس نے ماہ وسال کا حساب بھی جوڑ لیا اور ناک نقشے کی شطرنج بھی جمالی کہ اُس ماہ رو کا بیان کتنا وزن رکھتا ہے۔ اس طرح کی شہادت ٹٹولنے میں تو امام بخش ید طولیٰ رکھتا تھا۔ سو اس نے پہلو بدلا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال

کے سوال کیا: ''تو آپ مونی شاہ کی بہن ہیں۔''

''میں کسی مونی شاہ کو نہیں جانتی۔ جسے جانتی تھی بتا دیا ہے۔ اب آپ میرا شجرہ خود جوڑیں اور اسی لیے تو آپ کو زحمت دی ہے کہ مونی شاہ کو میرے شجرہ نسب میں ایسے جوڑیں جیسے نگینہ انگوٹھی میں جڑا ہوتا ہے اور پھر میں مونی شاہ کو یہ سیڑھیاں چڑھتے دیکھوں گی اور اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہوگا۔''

اب تو امام بخش اس قصے کا خود کردار بننے کو تیار ہوگیا۔ کبھی کبھی قصہ گو بھی کہانی کا کردار بننے کے لالچ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہی امام بخش کے ساتھ ہوا اور اُسے ایک بڑی الف لیلیٰ کا سامنا تھا۔ مونی شاہ کون تھا، کیا تھا اور وہ سجادہ نشین شاہ قربان علی عرف بہار علی کی کون سے نمبر کی اولاد تھا، یہ جاننا ضروری ہے لیکن اب کہانی کو روکنا مناسب نہیں پہلے اُس جمال زادی کی کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ مخدوم زادی اپنی داستان امراؤ جان ادا بیان کرتے ہوئے بولی ''کہ میری ماں مخدوم علی قربان شاہ سجادہ نشین کی رعایا میں شامل تھیں۔ ہر جمعرات کو مخدوم سائیں درگاہ پر تشریف لاتے تھے۔ میرے نانا جان کہ رعیت میں شامل تھے اور درگاہ کے انتظام و انصرام اور لنگر خانے کے ناظم تھے۔ ہفتے کے سات دنوں میں کیا کچھ لنگر خانے میں تیار ہوگا اُن کی ذمہ داری تھی۔ کبھی کبھی میری ماں بھی ابا کے ساتھ لنگر خانے جاتی تھیں۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ لنگر خانے میں سبزیاں، چاول اور گوشت تھال کے تھال سجے ہوتے تھے اور پھر ابا حکم دیتے کہ کیسے کیسے کیا دیگوں میں ڈالنا ہے اور تندوروں میں اور الٹے توؤں پر کیسے اور کتنی روٹیاں ڈالنی ہیں۔ ابا بس اسی میں مگن رہتے تھے کہ ایک دن کیا ہوا؟

اب امام بخش کے کان کھڑے ہوئے کہ ایک دن کیا ہوا؟

ایک دن یہ ہوا کہ میری ماں سجادہ نشین مخدوم علی قربان شاہ کی جمعراتی آمد سے ذرا پہلے لنگر خانے سے دربار میں آئی تو سامنے نانا جان کے ساتھ مخدوم علی قربان شاہ عرف

بہار علی جبہ کلاہ اور دستارِ فضیلت زیب تن کیے آ رہے تھے۔ جب میری ماں پر اُن کی نظر پڑی تو پھر اُٹھ نہ سکی۔ سِن ہوگا کوئی اٹھارہ کا اور چڑھتے سورج کی اٹھان کے ساتھ آموں کے بُور جیسی ہلکورے لیتی خوشبو جیسے مُشک مچاتی ہوئی جسمانی گرمی ہوگی۔ کچھ ایسے ہی اماں کی کاٹھی تھی۔ مخدوم علی قربان شاہ اپنے نام کی طرح پگھلنے لگے کہ نانا جان بولے، یہ اپنی بالڑی ہے۔ آپ نے ہی اس کا نام رکھا تھا، شہر بانو اپنی گود میں بچی کو بٹھا کر دعا دی تھی، جب یہ پیدا ہوئی۔

اب مخدوم صاحب نے پلک جھپکی۔ ساتھ ہی نانا جان نے اشارہ دیا کہ مخدوم صاحب کے پاؤں چھولو۔ ایسے میں اماں آگے بڑھی اور اس نے طِلّے کے کُھسّے پر اپنا نازک ہاتھ رکھا تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے طلائی پازیب پر اس کا ہاتھ آ گیا ہو۔ اماں کی آنکھیں نیچی تھیں اور نیچی رہیں۔ اب مخدوم صاحب کو یاد دلایا گیا کہ شہر بانو نام بھی آپ نے دیا تھا اور دعا بھی کی تھی تو ان کی سُرمگیں آنکھوں میں خواب جاگنے لگے اور بس اتنا بولے ''یہ لڑکیاں بھی بس انگوروں کی بیل کی طرح جلدی پھیل جاتی ہیں۔ خیر دعا کا بھی اثر تو ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

امام بخش کے دھیان میں کتھاؤں کی رام لیلا جاگ اُٹھی۔ الف لیلیٰ، توتا کہانی، داستانِ امیر حمزہ اور نہ جانے کتنے زمانوں کی بھولی بسری کہانیاں اُس کی یادوں کے گھونسلے میں چہچہانے لگیں۔ اب امام بخش کی زنبیل میں کچھ قصوں کی پنیری پھوٹنے لگی تھی۔ ایسے میں وہ اُس جمال زادی کے روبرو سوالی بن کر بیٹھ گیا۔ پھر اُس نے کلام کیا۔

''اب نانا جان تو جیسے خانوادے کے اصیل خادم ٹھہرے۔ وفاداری کا اسمِ اعظم تو جیسے گھوٹ کے پی رکھا تھا۔ سو دوزانو ہو کر بولے ''جی مخدوم صاحب آپ ہی کی امانت ہے۔''

شاید نانا جان اپنی بیٹی کے ذریعے کوئی رتبہ حاصل کرنا چاہتے تھے یا محض یہ عقیدت کی کارگزاری تھی۔ یا پھر درگاہ کی سبز بوٹی کا کمال تھا کہ وہاں سبز بوٹی کا راج بھی تھا

جس کے لیے ایک نعرہ بلند ہوتا تھا۔ ''ساوی سب پر حاوی'' مطلب یہ تھا کہ سبز بوٹی کو گھوٹ کے کسی کو پلا دو تو وہ سب پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اب ایسا ہوا کہ چند دن کا وقفہ پڑا اور مخدوم صاحب قربان علی شاہ عرف سجادہ نشین بہار علی نے نانا جان کو طلب کر کے اپنا حکم سنا دیا کہ جسے میں نے نام دیا تھا ''شہر بانو'' اب اُس کا رشتہ مانگ رہا ہوں۔ گود میں بٹھایا تو کیا ہوا؟ مرد کا اصل تو مرد ہی کا اصل ہوتا ہے۔ اس لیے شہر بانو کو میرے پردے میں دے دو۔ اس کا اصل تو یہی پردہ ہے۔ میرے زنان خانے میں آ جائے گی تو اللہ کی نظر میں پاکباز ٹھہرے گی۔ سو پردوں میں لپٹی رہے گی۔ پیرزادی بنے گی، مُرشدزادی کہلائے گی۔ حضرت بی بی کہلائے گی۔ قبلہ گاہی بنے گی۔ درگاہی بی بی بنے گی اور کیا چاہیے؟

اب نانا جان کا سر مزید جھک گیا بلکہ نانا جان اسے اپنے لیے فضیلت سمجھ رہے تھے یا نیازمندی کے اعلیٰ درجے پر پہنچنے کی سعی کر رہے تھے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ اگلے دن نانا جان میری ماں کو سرخ دوپٹہ ڈال کے خالی کانوں خالی ہاتھوں کے ساتھ سجادہ نشین مخدوم علی قربان شاہ عرف بہار علی کی درگاہ پر لے آئے اور وہاں موجود متولی امام مسجد نے نکاح پڑھا دیا اور میری ماں سجادہ نشین مخدوم علی قربان شاہ عرف بہار شاہ کے عقد میں آتے ہی ان کے حجلہ عروسی کی زینت بن گئی۔ مگر ذرا رکیں۔

اب تو امام بخش کہانی کے جادو سے جاگے اور انہیں اچھا نہیں لگا کہ کہانی کو بلا وجہ روکا جائے۔ خیر جمال زادی نے جلدی یہ اڑچن دور کر دی کہ جونہی میری اماں اُس حجلہ عروسی میں آئیں تو تین مختلف عمروں کی خواتین آ گئیں۔ ایک کے ہاتھ میں پھلوں کی قاب تھی جس میں سیب، انگور، انار اور ناشپاتی موجود تھی۔ دوسری کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ تیسری کے ہاتھ میں شہد اور مکھن میں گندھا خشک میوہ تھا اور تینوں نے اس اٹھارہ سال کی میری ماں سے کلام کیا۔ میں مخدوم سائیں کی پہلی بیوی ہوں۔ قبول کرو یہ پھل کہ میں تمہیں مخدوم سائیں کے لیے تیار کرنے آئی ہوں۔

اب دوسری بولی ''صبح تمہیں غسل دے کر پاک صاف کرنے کی ذمہ داری میری ہے۔ پوشاک پہنا کر تیار کروں گی کہ لوگ دیکھنے آئیں گے اور تمہاری گود میں سلامیاں ڈالیں گے کہ یہ رسم چلی جاتی ہے۔''

اب تیسری کہ سن میں اُن سے چھوٹی اور بیر بہوٹی قسم کی تھی، گویا ہوئی کہ ''تمہارے ناشتے اور کھانے پینے کی دس دن تک میری ذمہ داری ہے۔ پاؤں زمین پر نہ رکھنے دوں گی۔ ایسے ہی اپنے مرشد حضرت علی قربان علی شاہ عرف بہار شاہ کا حکم بھی ہے اور ہاں دس دنوں تک مرشد رات کو آپ کے حجلہ عروسی کی زینت بنیں گے۔ اس کے بعد ہر رات وہ باری باری ہم سب کے مہمان ہوا کریں گے۔ یہ دستور ہے۔ شاہ جی کسی سے فرق کے قائل نہیں ہیں۔''

''یہ جو ہر رات وہ باری باری سب کے ہاں جاتے ہیں تو کوئی حساب کتاب عورتوں کی طہارت اور مہینے کی مجبوری کا بھی رکھا جاتا ہے کہ نہیں۔'' بے ساختہ ہو کر میری ماں نے یہ بات کر دی۔ اس پر وہ تینوں کھلکھلا کر ہنس دیں اور ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر یکدم سنجیدہ ہو گئیں۔ پھر ایک بولی ''بس تم نے اس پر نہیں سوچنا۔ یہ حساب کتاب کی باتیں ہیں۔ مرشد جی چاند راتوں کا حساب رکھتے ہیں تو یہ بھی رکھتے ہوں گے اور نہ بھی رکھیں تو......وہ تو پہنچے ہوئے ہیں۔''

ان میں سے پہلی بیوی بولی ''دیکھو یہ دودھ فروٹ میں تمہارے لیے لائی ہوں اور ہاتھوں سے کھلا پلا کے تیار کروں گی کہ مرشد جی ذرا ہاٹھی کاٹھی کے مضبوط اور حکیموں، ویدوں اور خاندانی نسخوں پر پل کے جوان ہوئے ہیں اس لیے تمہاری چیخیں اس حجلہ عروسی سے باہر نہیں جانی چاہئیں۔ اپنے پر قابو، ضبط اور حوصلے اور برداشت کا پہلی رات تو تمہیں مظاہرہ کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد تم عادی ہو جاؤ گی کہ مردوں کی شان یہی ہے کہ وہ ہر رات بستر پر عورت کو فتح کر کے باہر آئیں۔ کبھی تم نے اونچے شملے اور سنہری پروں والی کلغی کے

گوڑی ککڑ کو دیکھا ہے جو اکیلا تمام مرغیوں کا محافظ بھی ہوتا ہے اور ان کے آس پاس گُٹکتا بھی ہے۔ پاؤں اٹھا کر ان کو قابو میں لانے کی کوشش بھی کرتا ہے اور پھر وہ اکیلا ان تمام مرغیوں پر دیوانہ وار حملہ بھی کرتا ہے اور انتہائی کمزور مرغی کو زیر کر کے اس پر سواری بھی کرتا ہے اور جب اُترتا ہے تو پر پھیلا کر بانگ دے کر اپنی فتح کا اعلان بھی کرتا ہے۔ کیا تم نے یہ نظارے نہیں دیکھے تو بس یہی تمہارے ساتھ پیش آئے گا۔ تم مرغی ہو اور ذرا کمزور جسم والی ہو مگر خدا نے کمزور مرغی کو بھی اتنی طاقت دی ہے کہ پورے وزن سے وہ گوڑی مرغ کہ اصیل نسل کا ہوتا ہے، اس پر سوار ہو جاتا ہے مگر مرغی کی کمر نہیں ٹوٹتی، اس لیے ڈرنا نہیں۔"

اب میری ماں نے یہ سب سنا اور سُن ہوگئی۔ اس نے کبھی پھولے پروں والے اونچے قد کاٹھ کے سنہری کلغی اور گردن کے ساتھ مرغ کو کسی کمزور مرغی پر چڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، اس لیے وہ سہم گئی۔ وہ تینوں چلی گئیں اور پھر سناٹا ہے۔ ماں نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ جب میں اُس کے پیٹ میں آئی تو ماں نے میرے سے مکالمہ کیا ہوگا جواب میرے دھیان میں آرہا ہے۔

"اگر تو لڑکی ہوگی تو میں اُس سے کہوں گی کہ اس دنیا میں مت آؤ۔ یہاں بہت سے اصیل مرغے موجود ہیں جو کمزور مرغیوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ اس دنیا میں لڑکیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ چھ مہینے کی بچی کو بھی ریپ کر دیا جاتا ہے اور پھر ہر عمر کے ساتھ لڑکی کی حفاظت لازمی کی جانی چاہیے ورنہ وہ باپ، بھائی، ماموں، چچا، دادا، نانا، خالو کے ہاتھوں کچلی جاتی ہے۔ یوں تو لڑکے بھی اس زبردستی کا شکار ہو کر جان ہار جاتے ہیں مگر بیٹی ایسا لڑکیوں کے ساتھ زیادہ ہوتا ہے۔ اب تم اندر ہی کوکھ میں سانس دبا لو تو اچھا ہے۔ اپنا سانس آنے سے پہلے ہی اُس سانس کا راستہ روک لو۔ بھلے اس عمل میں مجھے موت آجائے۔ کوئی بات نہیں۔"

امام بخش کو کاٹو تو لہو نہیں، وہ بننے گیا تھا مرزا ہادی رسوا کہ امراؤ جان ادا کا مصنف

بنے گا مگراب اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ پریم چند ہے جس نے "بوڑھی کا کی" اور "ٹھا کر کا کنواں" یا "کفن" لکھا ہے یا وہ سعادت حسن منٹو ہے جس نے "کھول دو"، "ٹھنڈا گوشت" اور "ننگی آوازیں" لکھا ہے۔ اب اس نے ادب آداب ایک طرف کر کے کہا "دیکھو جی یہ میری ماں کی کہانی ہے۔ میری کہانی تو شروع ہی نہیں ہوئی کہ میں اُس کے پیٹ میں تھی جب یہ سب ہو گیا تھا۔"

"تو اب پیٹ سے باہر آ وَ بی بی۔" امام بخش نے فریاد کی۔

"بس قصہ گو تھک گیا۔ ہمت ہار گیا۔ ابھی بہت کچھ سننا اور سہنا پڑے گا۔ اگر حوصلہ نہیں تو جاؤ خود کو اس کشٹ میں نہ ڈالو۔"

اب امام بخش کوئی ہار ماننے تو نہیں تھا، وہ بھی ایک طوائف کے کوٹھے پر......اس لیے اپنی بہادری کو مجتمع کر کے بولا......"دراصل قصہ گو کی خورجین میں بہت کچھ بھرا ہوتا ہے جیسے بارود ہوتا ہے تو دیکھنا پڑتا ہے کہ نئے واقعات کی گنجائش ہے یا نہیں تو ایسا ہے کہ اب تم اپنی کہانی سناؤ۔"

اس پر وہ پہلو بدل کے بولی "ماں کی کہانی میں چونکہ میں بھی ہوں تو سنو۔ جب تک میں جوان نہیں ہو جاتی کہانی چلے گی۔"

اب امام بخش کی قصہ گوئی کا امتحان تھا۔ سو وہ خاموش رہا کہ عام طور پر قصہ گو وہی ہوتا ہے جو مختلف موقعوں پر خاموش رہے۔ اب امام بخش نے بس نظر چُرائی جس کا مطلب یہ تھا کہ بولو بی بی جو بولنا ہے۔ اس پر وہ بولی......

"قصہ گو میرے قصے میں کئی موڑ آئیں گے۔ میں امراؤ جان ادا نہیں ہوں جسے گوہر مرزا لوٹ لاٹ کے بھی ڈھیٹ بنا پھرتا ہے یا فیض علی ڈکیت لے اڑتا ہے اور امراؤ ہوا پر پتے کی طرح تیرتی رہتی ہے۔ یہ کوئی کردار ہے امام بخش؟"

اب امام بخش پھر چکرا گیا کہ یہ کوٹھے والی مشکل سے طوائف بھی نہیں ہے تو مجھے

کیوں گھما پھرا رہی ہے اور وہ گنگ دام بیٹھ گیا اور بولا" اے جمال زادی میں نہ تو مرزا ہادی رسوا ہوں نہ کوئی قصہ گو۔ صاف صاف بول آگے کیا ہوا؟"

اب وہ بولی کہ "جب میں ماں کے پیٹ میں تھی تو سجادہ نشین مخدوم علی قربان عرف بہار شاہ کو عین اس وقت حجرے میں قتل کر دیا گیا جب وہ ہر جمعرات کو اپنے مریدوں کو دیدار دینے کے لیے آتے تھے اور سب کی گزارشیں سن کر فیصلے کرتے تھے۔ اب وہ حجرے میں قتل ہو گئے تو میری اماں کے پیٹ میں میرا جنم تو مشکوک ہو گیا۔"

"سجادہ نشین کے قتل کا معمہ کون حل کرے گا۔ آپ تو ماں کے پیٹ میں تھیں۔"

امام بخش چکرا گیا تھا کہ کہانی میں اہم موڑ چکا تھا۔

جمال زادی بولی کہ "قصہ گو آپ بہت کمزور ہو۔ اب کڑیاں جوڑنا تو آپ کو آنا چاہیے کہ آپ نے مونی شاہ کا ذکر کر دیا ہے۔ میں نہیں کہتی قتل مونی شاہ نے کرایا، میں تو ماں کی کوکھ میں تھی۔ ہاں تو کہانی بولتی ہے کہ سجادہ نشین کے قتل کے بعد پولیس آئی اور میرے نانا نے ان کی بہت خدمت کی۔ دن بھر پولیس چارپائیوں پر لوٹ لگاتی رہتی تھی۔ بھوجن کی تمام اقسام ان کے حضور پیش کی جاتی تھیں...... نانا ان کی سیوا میں لگے تھے کہ سجادہ نشین سائیں کے قاتلوں کا سراغ مل سکے۔ سراغ تو مل جاتا اگر پولیس دل سے چاہتی۔ پولیس کو اس کیس میں اپنا مستقبل دور تک دکھائی دے رہا تھا اس لیے ان کی دلچسپی اس کیس کو الجھانے میں تھی۔ حل کرنے میں نہیں تھی۔ سو کیس کو پولیس نے اپنی تجرباتی مہارت سے ایسا الجھایا کہ سکاٹ لینڈ یارڈ بھی اُسے نہیں سلجھا سکتی تھی۔"

"سکاٹ لینڈ یارڈ کو آپ کیسے جانتی ہیں؟" امام بخش چونک کر بولا۔

"میں کانونٹ میں پڑھی ہوں۔ کیا طوائفیں کانونٹ میں نہیں پڑھ سکتیں؟" اب تو امام بخش کی معلومات کا بھرکس نکل گیا مگر چونکہ کائیاں آدمی تھا، سنبھل گیا "ہاں، ہاں کیوں نہیں پڑھ سکتیں۔ بیان جاری رکھو۔"

"اب ایسا ہوا کہ سجادہ نشین کی تو اولاد تھی نہیں تو لواحقین میں مقدمے بازی شروع ہو گئی۔ فائدہ پولیس اور وکیلوں کو ہونے لگا۔ جائیدادوں پر افتاد آ پڑی۔ ایسے میں پہلا نشانہ تو میری ماں کو بنایا گیا۔ وہ مجھے پیٹ میں تھام کے میرے نانا کے ساتھ حویلی سے الگ ہو گئی کیونکہ میرے نانا کا تام جھام اور رتبہ رعائیت سب چھین لیا گیا تھا۔ میری اماں کے ساتھ تین اور بیبیاں کہ سجادہ نشین کے حرم اور شرم کی محافظ تھیں، ایک ایک کر کے اپنے اپنے حجروں میں پہنچا دی گئیں۔ ایک کے پیٹ میں مونی شاہ پل رہا تھا۔ سو میں اور مونی شاہ اوپر نیچے دنیا میں آئے۔ امام بخش یہ بات اگر تجھے معلوم ہے تو اب راز سمجھ کے سینے میں رکھنا۔ مجھے مونی شاہ سے کچھ حساب کتاب کرنا ہے۔ خیر تو کہانی بڑھتی ہے۔ سجادہ نشین مخدوم علی قربان شاہ عرف بہار علی کے قتل کا معمہ قانون کی کتابوں میں اور سرکار کے انصاف میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔

اب کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اتنی بڑی گدی پر جس نے بیٹھنا تھا، یہ سارا شطرنجی کھیل اُسی نے تو شروع کیا تھا۔ وہ کون تھا؟ ان راہداریوں، غلام گردشوں اور تاریخ کے مقبروں کے پچھواڑوں میں پلنے والے کچھ ایسے کردار بھی ہوتے ہیں جو راندۂ درگاہ ٹھہرتے ہیں اور لوگ بھول جاتے ہیں کہ وہ کبھی بھی جالیوں کے سوراخوں سے بہت کچھ دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ گدی ہزار سال سے چل رہی تھی۔ شاید اُس سے بھی پہلے سے جب برصغیر پر اسلام کا سورج چمکا تھا۔ گدی تو محکمہ اوقاف کے قبضے میں تھی مگر سجادہ نشین مخدوم قربان علی شاہ عرف بہار علی سیاسی اثر رسوخ کی وجہ سے بہت سے حقوق پر قابض تھا۔ ایک تو اس نے درگاہ کے اطراف کی زمینیں، ملی بھگت سے اپنے نام کرا لی تھیں۔ دوسرے مریدین میں اُس کی دھاک بٹھانے کے لیے پورا ایک محکمہ موجود تھا۔ اس میں نیم ادیب نیم صحافی نیم دکاندار نیم پرچونیے نیم پبلسٹی ماسٹرز شامل تھے جو سجادہ نشین کے لیے وقتاً فوقتاً مذاکرے، سیمینار، اور صوفی نائٹس قسم کے پروگرام کرتے رہتے تھے جن میں کرائے کے دانشوروں کو باقاعدہ

لفافے تقسیم ہوتے تھے۔ اخباروں کے رپورٹرز اور ایڈیٹروں کی خدمات بھی باقاعدہ حاصل کی جاتی تھیں۔''

امام بخش یہ سب سنتا رہا۔ آخر بولا کہ ''کہانی تو آپ اچھا چلا رہی ہیں۔ میں نہیں بولا کہ گنجائش نہیں تھی لیکن اب بولا ہوں کہ وہ کہانی کہاں گئی، مطلب کہ قتل کا معمہ؟''

''اب آپ بے صبرے ہو گئے۔ اچھے سامع تو بنو۔ پردے کے پیچھے سے جب کچھ آتا ہے تو درجہ بدرجہ آتا ہے۔''

امام بخش شرمندہ ہوا کہ اُسے عمر نے اب کچھ زیادہ ہی بے صبرا کر دیا تھا...... اب پھر کہانی نے خود کو بڑھایا۔ اب کیا ہوا کہ اُس درگاہ کے سجادہ نشین کا ایک سوتیلا بھائی کہ دن بھر بھنگ اور ہمہ قسم نشوں میں چُور رہتا تھا مگر تھا کائیاں۔ نشہ وغیرہ تو گویا اس نے وقت کو دھوکہ دینے کے لیے ایک بہانہ بنا رکھا تھا۔ اس کے موالیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ تمام تر نشے بازوں اور موالیوں کو یہ اُمید دلا دی گئی تھی کہ اصل گدی کا وارث یہ سوتیلا بھائی ہے۔ جس کا نام شعبان علی شاہ عرف مولائی سرکار پڑ گیا تھا۔ راندۂ درگاہ نے اپنی روزی، روٹی کا وسیلہ یہ نکالا کہ سیاست کے شہ سواروں کا شہ بالا بن گیا تھا۔ ویسے تو ایسے کو چمچہ کہتے ہیں، مگر شہ بالا ذرا بہتر رتبہ تھا۔ شعبان علی شاہ عرف مولائی سرکار نے ہر ایم این اے، ہر ایم پی اے کو یہ یقین دلا رکھا تھا کہ اس کے مریدین کے تمام ووٹ اُس کے ہاتھ میں ہیں اور اس کام کے لیے وہ عوام میں بہت وقت گزارتا تھا۔ پولیس میں اُس کی عزت تھی اور اس آڑ میں وہ چھوٹے موٹے بھتے اور مقامی بلدیاتی فنڈز میں سے ٹُچکا لگا لیتا تھا۔ بس اس مار دھاڑ میں اُس کا ٹیم پاس ہو رہا تھا۔ نشے کا سامان تو وہ اکثر پولیس والوں سے حاصل کرتا تھا۔ مقامی صحافیوں سے بھی تعلق رکھتا تھا اور اس طرح اُس نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ اُس کی اصلی سجادہ نشین مخدوم علی قربان سے مقدمے بازی چل رہی ہے اور وہ جلدی کیس جیت جائے گا اور برابر کا حصہ دار قرار پائے گا۔ بس یوں سمجھیں شعبان علی شاہ کی خفتہ صلاحیتوں نے ایک ایسا

رنگ اختیار کیا کہ وہ اس پوزیشن میں آ گیا کہ اس نے یہ حساب لگا لیا کہ اگر مخدوم علی قربان شاہ کی دو حرم کی بیویوں کے پیٹ میں پلنے والے لاڈلے باہر آ گئے تو وارثوں کا انبار لگ سکتا ہے اور مریدین کے چُنگل سے درگاہ کو اُچک لینا مشکل ہو جائے گا۔ بس یہاں شعبان علی شاہ عرف مولائی سرکار کو اُس لمحے کا انتظار تھا جب قربان علی شاہ عرف بہار علی کو قتل کرا کے خود گدی نشین بن جائے۔

قدرت نے اُسے ایک موقع یوں فراہم کیا کہ گویا اُس کی گود میں گدی خود بخود آ کے گر گئی۔ ہوا یوں کہ مخدوم علی قربان شاہ کی اُن دنوں ایک مقامی ایم این اے سے اوقاف کی زمین کے حوالے سے بیان بازی چل رہی تھی۔ بس اس شک کا فائدہ شعبان علی شاہ کو چاہیے تھا۔ باقی پولیس اور میڈیا میں اُس نے اپنا کام کر لیا تھا۔ سو ایک اندھی گولی نے مخدوم قربان علی شاہ عرف بہار شاہ نے درگاہ پر ہی دَم دے دیا۔

اب امام بخش نے کہانی کا مرکزی بھنور تو پکڑ لیا تھا۔ سو اُس جمال زادی سے کہانی کے اگلے پڑاؤ کی طرف رجوع کرنے کی گزارش کی۔

"بس پھر ایسا ہوا کہ شعبان علی شاہ نے کورٹ سے گدی کا پروانہ لیا اور اُس نے جو جال بچھایا تھا، وہ ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ اب قربان علی شاہ کی مخدومی کا قصہ تمام ہوا اور اُس کے حرم سے تین بیبیاں بے دخل قرار پائیں۔ حرم مخدوم قربان علی شاہ تک تو قائم تھا مگر جب حرم میں رہنے والی تین اوپر نیچے کی بھری پُری عورتیں بے دخل ہوئیں تو دو کے ہاں امید سے بندھے دو ذی روح پیٹ میں پل رہے تھے۔ اب وکیلوں نے ان تینوں سے ہمدردی جتائی۔ مفت کیس لڑنے کا عندیہ بھی دیا۔ وکیل کبھی باپ کا کیس بھی مطلب کے بغیر نہیں لڑتے تو دو چار کی رال ان پر ٹپکی اور سوچا مخدوم قربان علی شاہ کی کوئی ایک آدھ حرم کی بی بی ہاتھ لگ جائے تو کیا برا ہے مگر ان وکیلوں سے شعبان علی شاہ عرف مولائی سرکار نے انہیں اس طرح بچا لیا کہ ان کے لیے پرانی حویلی مخصوص کر دی اور دو خادمائیں بھی ہمہ وقت حاضر

کر دیں کہ ان کو تنخواہ دینی نہیں تھی۔ بس لنگر پر انہیں گزارہ کرنا تھا۔ اس طرح کورٹ کچہری میں بات نہ چڑھی اور شعبان علی شاہ عرف مولائی سرکار نے ممکنہ بغاوت کو تجربے سے سنبھال لیا۔ اب کہانی آگے بڑھتی ہے کہ مونی شاہ اور میرا کردار آنے والا ہے۔''

وہ جمال زادی یہاں رک گئی۔ اب امام بخش کی روح تھرتھرائی۔ دماغ کلبلایا دل دھڑکا کہ اب کیا سامنے آنے والا ہے۔ اس کیفیت میں امام بخش کو چپ لگ گئی کہ اب جو آتا ہے آئے، وہ پھر سے رواں ہوئی۔

''اب اگر میں بچپن یاد کروں اور اس پرانی حویلی میں تین اجڑی ہوئی مخدوم کی بیویاں کیسے نباہ کر رہی تھیں۔ بیان کروں تو دفتر سیاہ ہو جائیں گے۔ بس اتنا بول دوں کہ مونی شاہ اور میں پیدا ہو کر اُس پرانی حویلی میں یوں بڑے ہوئے جیسے دو دشمن ایک محاذ پر آمنے سامنے ہوتے ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ دونوں کی کیمسٹری جدا جدا تھی۔ مونی شاہ کو یہ سہولت حاصل تھی کہ وہ خاندانی ماں کے بطن سے اچھل کر باہر آیا تھا اور میں رعایا میں سے ایک عورت کے بطن سے تولد ہوئی تھی اور میری ماں کی بھی کیا زندگی رہی ہوگی۔ اٹھارہ سال کی تھی، میں آ گئی۔ اب میں اور ماں ایک ساتھ بڑھ رہے تھے۔ جوانی تو جیسے اُس نے دیکھی نہ تھی کہ میں نے قد کاٹھ نکال لیا۔ ناک نقشہ ماں اور مخدوم قربان علی شاہ پہ جانا ہی تھا تو اندھیرے کا چاند بن کے رہ گئی لیکن ماں اور بیٹی جب اوپر تلے جوبن پہ آ رہے ہوں تو پھر کسی ایک کو تو اپنا جوبن چھپانا ہوتا ہے تو ماں نے خود کو پردے میں کر لیا۔ چادر اوڑھ لی اور مجھے بھی اوڑھا دی کہ کہیں کسی مخدوم زادے یا درگاہ کے کارکن کی نگاہ نہ پڑ جائے۔ اب غلافوں میں ہم بندھے رہے مگر مونی شاہ اندر سے مخدوم قربان علی شاہ کا بدلہ لے کر پیدا ہوا تھا۔ وہ غلیل چلاتا، برتن توڑتا، ماں کی چٹیا کو رسی باندھ دیتا اور ماں گر جاتی۔ دوسری ماں کو آم کا لالچ دے کر پتھر کو ٹھنڈا کرنے کے لیے جگ میں ڈال دیتا۔ ایسے ہی بہت سے واقعات نے مونی شاہ کا دبدبہ بنا دیا تھا مگر وہ یہ ہوم ورک کسی اور مقصد کے لیے کر رہا تھا۔''

''بس بس۔ یہ ہوم ورک آ گیا کانونٹ کی طرف سے۔ تو آپ کے اندر سے اس چکلے اور کوٹھے یا بالا خانے کی روح تو باہر نہیں آئی۔ یہ تو کوئی اور روح ہے جو شاید دبی ہوئی تھی۔ اور وہ یہ کوئی اور روپ لے کر آ گئی ہے۔'' امام بخش چکرا گیا اور اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کہانیوں کا گرداب کیا سے کیا دکھلاتا ہے اور کہانی اپنے سننے والے کو کتنے گھاٹ گھاٹ کا پانی پلاتی ہے۔ بلی کی طرح بچوں کو سات گھروں میں کیسے گھماتی ہے۔ امام بخش کے لیے یہ ایک اور پڑاؤ تھا۔ اس ناری کو جاننے کے لیے۔ سو وہ اپنی لگام اُس کے ہاتھ میں دے کر بے چنت ہوا......

''تو مونی شاہ نے جتنی جلد قد بڑھایا اتنی جلدی اُس نے ماں کا بدلہ لینے کے لیے مجھ سے ضد کا رشتہ بنا لیا۔ وہ ایسے کہ اُسے لگتا تھا کہ میں اُس کا راستہ روک لوں گی اور میں روک بھی سکتی تھی کہ میری کاٹھی دنیا میں کچھ بھی کر سکتی تھی۔ دنیا کو اپنے ابروؤں پر اٹھا سکتی تھی۔ ابرو محض ابرو تو نہیں ہوتا۔ آنکھ کی طاقت سے اُس میں جنبش ہوتی ہے تو مونی شاہ کو میں دیکھ رہی تھی۔ راہداریوں میں مونی شاہ نے جوانی کی پہلی سیڑھی پر پرانی حویلی کی غلام گردش میں خدمت پر مامور دایہ منظوراں مائی کی بیٹی کنیزاں کو حاملہ کر دیا۔ بات کو دبانے کے لیے کنیزاں کو زمین میں دبایا گیا۔ یہ رات پڑنے سے پہلے کا واقعہ ہے کہ مونی شاہ نے اپنے ساتھ چرسیوں، افیمیوں اور کچھ ملنگوں کو بلایا اور ان کو کچھ نہ بتایا۔ بس ان کی پوری خدمت کی۔ پھر غلام گردش میں ایک قبر کھودی گئی اور رات کے اندھیرے میں کنیزاں کو مونی شاہ لے کر آیا کہ ہم بھاگ کر شادی کر رہے ہیں۔ وہ سرخ چنری لے کر آئی اور چلتے ہوئے اس نے دیکھا بھی نہیں کہ قبر میں گر گئی۔ اس پر مٹی ڈالنے والوں نے دیر نہ کی اور پل کی پل میں وہ قبر میں دب گئی۔ اوپر اینٹیں لگا دی گئیں۔ بات غلام گردش میں گم تو ہو گئی مگر مجھ تک پہنچ گئی۔ میں نے مونی شاہ کو پکڑ لیا کہ یہ واقعہ ہوا ہے تو اس نے کہا، ہاں ہوا ہے اور بھی اسی طرح کے واقعات ہو سکتے ہیں۔ یہاں تمہاری گواہی سننے والا نہ یہاں ہو گا نہ تھانے میں

ہوگا اور نہ عدالت میں ہوگا تو سوچ لو کیا کرنا ہے۔ اب میرے پاس تو آس پاس کوئی بھی نہیں تھا جسے سارا سچ بتاتی۔ البتہ آدھی رات کے بعد پوری حویلی میں مجھے چیخوں کی آواز آتی رہی۔ تواتر سے حویلی میں چیخیں گونجتی تھیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ حیرت ہوتی کہ کسی اور کو وہ چیخیں سنائی نہیں دیتی تھیں۔ پھر مجھے کیوں سنائی دیتی تھیں......''

اب امام بخش کو بولنے کا موقع مل گیا۔ ''وہ ایسے کہ آپ کے تحت الشعور میں وہ واقعہ بیٹھ گیا تھا۔''

''امام بخش میں کسی تحت الشعور کو نہ جانتی ہوں، نہ مانتی ہوں۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ سولہ سال کی لڑکی جس کا جسم ابھی پھوٹا ہی نہیں تھا، ابھی تو اس نے موسم کا سہارا لے کر بس ٹانڈے کا قد اپنایا تھا کہ پکڑی گئی اور کھیت میں ٹانڈا وہیں پر خشک ہوگیا۔''

''تو پھر آپ نے اس لڑکی کے لیے کوئی آواز نہ اٹھائی......'' اب امام بخش تڑخ گیا۔

''ہاں نہیں بولی کہ کنیزاں واپس نہیں آ سکتی تھی اور مجھے مونی شاہ سے بدلہ لینا تھا۔ وہ مجھے پرانی حویلی سے ماں سمیت نکلوانے کے لیے ایک مکمل کھیل تیار کر چکا تھا جس میں میری ماں کہ جو سیاہ پوش ہو چکی تھی، عمر تو مشکل سے چالیس سال سے دو کم ہی تھی مگر جوانی کی آگ کو راکھ میں بدلنے کے لیے اندر ہی اندر سلگنا تو بنتا ہی تھا، کو رات کے پچھلے پہر حویلی کے پچھواڑے سے کسی کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑوانا تھا۔ امام بخش یہ عورتیں رنگے ہاتھوں کیسے پکڑی جاتی ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر مہندی کا رنگ ہوتا ہے یا خون کا یہ پہلی ماہواری کے خون کا لہو کا رنگ ہوتا ہے۔''

اب امام بخش کی قدیمی دانش کا امتحان تھا۔ مگر امام بخش تو گویا صماً بکماً جیسے اس کی گردن پر کن کھجورا پھر رہا ہو۔ ایسے میں جمال زادی نے خود ہی اسے امتحان سے باہر کیا ''دیکھیں آپ کہانی پر دھیان دیں جیسے میں نے بتایا مونی شاہ نے کسی موالی کو تیار کیا کہ وہ

پچھواڑے سے ہو کر ہمارے اُس کمرے کی کھڑکی تک آئے جو اکثر گرمیوں میں کھلی رہتی تھی۔ اس لیے بھی کہ باہر سے کسی کے آنے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ پرانی حویلی محفوظ ہوتی تھی۔ اس لیے اُس رات کھڑکی کھلی تھی اور مونی شاہ کا سُدھایا ہوا موالی جسم سے گٹھا ہوا تھا اور آنکھوں میں افیم کی نیم وا افسردگی صاف نمایاں تھی۔ کھڑکی سے اندر آ گیا اور گر گیا۔ میں جاگ رہی تھی، چیخ ماری تو اماں اٹھ گئی۔ ساتھ ہی روشنی ہوئی اور مونی شاہ ہمارے دروازے سے اندر آیا۔ ہم دروازہ کھلا رکھتے تھے کہ زنان خانہ تھا۔ میں اور اماں خوف سے ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی تھیں۔ ایسے میں مونی شاہ گواہ نہیں بنا سکتا تھا کہ میری ماں رنگ رلیاں مناتے پکڑی گئی۔ اب منظر کچھ ایسا تھا کہ موالی زمین پر گرا ہے۔ ہم پلنگ پر ہیں اور مونی شاہ سامنے کھڑا ہے۔ وہ بولا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اُس نے دماغ لڑایا اور اتنا بولا کہ اوئے تو اندر کیسے آیا؟ یہ زنان خانہ ہے۔ وہ افیمچی تو گویا ڈر گیا۔ وہ کوئی ایکٹر تو تھا نہیں، فوراً مونی شاہ کے پاؤں میں پڑ گیا کہ سائیں مجھے معاف کر دیں۔ اب مونی شاہ ہکا بکا کہ کیسے معاف کر دوں۔ اس بات پر کہ تم نے وہ سب سبق بُھلا دیا جو پڑھایا تھا یا اس بات پر کہ اتنی افیم پھانک کے آیا ہے کہ سُدھ سے گیا ہے۔

اب ایسے میں مجھے سارا ڈرامہ سمجھ میں آ گیا...... میں نے مونی شاہ سے پوچھا ''آپ اس کمرے میں کیوں آئے؟''

وہ بولا ''آواز آئی تو میں نے سوچا کوئی خطرے کی بات ہے۔''

''خطرے کو اتنی جلدی کیسے سونگھ لیا؟''

''خطرہ خطرہ ہوتا ہے۔ اب میں آ گیا تو کیا ہو گیا۔ یہ جو اندر آیا ہے۔ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسے تمہاری ماں نے بلایا ہو گا۔''

اب اماں نے چیخ ماری کہ ''یہ جھوٹ ہے۔ شرم کرو مونی شاہ۔ یہ افیمی کیا کرے گا۔ مجھے بلانا ہو گا تو کسی مرد کو بلاؤں گی...... مجھ پر الزام لگانا ہے تو سنو درگاہ پر بلاؤ اپنے

باپ کے تمام مریدوں کو اور پھر مجھے لاؤ چادر کے بغیر اور پھر بولو میں کاری ہوں۔ میں بدکار ہوں اور پھر کہو اسے سنگسار کرو مگر پہلا پتھر وہ مارے جس نے گناہ نہ کیا ہو اور ہو سکے تو پہلا پتھر تم اٹھانا مگر مجھے پتہ ہے کہ تم پتھر نہیں اٹھا سکو گے کہ تم نے سولہ سال کی معصوم لڑکی کو غلام گردش میں زندہ دفن کیا ہے۔ بولو...... یہ سب کرو گے یا میں کچھ اور بولوں......''

اب مونی شاہ کی دُم پر پاؤں آ چکا تھا۔ کوبرے کی طرح اُس نے پھریری لے کر پھن نکالا...... ''اب تو آپ کا اس پرانی حویلی میں رہنا...... میرے لیے خطرناک ہے۔ اب میں اس افیمی کو درگاہ پر پیش کر کے تم پر الزام تو لگا سکتا ہوں مگر میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ یہ وار تو خطا گیا۔ اگلا خطا نہیں جائے گا۔ اب فیصلہ تم اور تمہاری بیٹی خود کر لے۔''

اس پر ماں نے مجھے اور میں نے ماں کو سنبھالا اور ہم نے رات کے پچھلے پہر وہ حویلی چھوڑ دی۔ اب جو باہر نکلے تو مجھے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ باہر کیا کچھ ہے۔ وہاں تو دنیا ہی نئی تھی۔ راستے کی ٹھوکریں تھیں۔ راستہ نہ سڑک نہ کوئی رہگزر۔ بس آڑے ترچھے قدم پڑ رہے تھے۔ معلوم نہیں اللہ کی زمین اتنی کھردری ہوتی ہے۔ میں کئی بار گری ہوں گی۔ اماں نے مجھے تھام رکھا تھا اور پھر میں نے بھی انہیں تھام رکھا تھا۔ صبح کا گجر بجا۔ روشنی کسی کنارے سے نکلی اور دیکھنے کو ملا کہ ہم کہاں ہیں۔ اسے صبح کاذب کہا جاتا تھا مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا۔ جب میں گری تو اماں نے کہا، یہ کھیت ہیں اور کھیت بھی وہ جہاں سے فصل اٹھائی جا چکی تھی۔ جب کھیتوں سے فصل اٹھا دی جاتی ہے تو آڑھی ترچھی راہیں اور ساتھ میں فصل کی باقیات کی جڑیں راستے میں کانٹے بن جاتی ہیں۔

امام بخش کو اب موقع مل گیا، وہ بولا ''اتنی بڑی آتش تم نے سینے میں چھپا کے رکھی ہے۔''

''ابھی تو آتش اندر دبی ہوئی ہے۔ ذرا حوصلہ رکھو۔ ہم دونوں سورج کی کرنوں کے ساتھ وہ کھیت عبور کر کے ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں میلے کیلئے کچھ تمبو لگے تھے۔ اصل میں

وہ تمبو نہیں تھے۔ وہ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں تھیں جو خیموں کی صورت لگائی گئی تھیں۔ میرے پاؤں آڑے ترچھے پڑ رہے تھے لگتا تھا موچ آ ئی کہ آ ئی۔ ایک بار ایسی گری کہ گھٹنے چھل گئے۔ اُٹھی تو اماں آنسوؤں کو پلّو سے پونچھ رہی تھی۔''

''ٹھہرو جمال زادی۔ مجھے خواجہ حسن نظامی کی ''شہزادی کی بپتا'' یاد آ رہی ہے۔ کیسے مغل شہزادیاں دربدر ہو کر محلوں سے نکلیں۔ کھیتوں میں پناہ لے لی تو اُن کو مچھر اور کیڑے مکوڑوں نے آ لیا۔ مجھے تو یہ ساری واردات مغل شہزادیوں کی لگ رہی ہے۔'' امام بخش کی تاریخ نے انگڑائی لی تھی۔

''امام بخش نہ میں مغل شہزادی تھی نہ میری ماں کسی درباری خون سے پیدا ہوئی تھی۔ میرے لیے یہ سختیاں کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں۔ تو ہم ایک جھونپڑی نما خیمے میں داخل ہوئیں۔ اندر جو دیکھا وہ میں تو سمجھ نہ پائی۔ اماں نے میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔''

''کیا دیکھا؟ کوئی قابلِ اعتراض منظر'' امام بخش بولا۔

''مجھے تو قابلِ اعتراض منظر کا بھی نہیں پتہ۔ کیا ہوتا ہے؟''

''خیر چھوڑو۔ جو دیکھا نہ دیکھا برابر ہے۔''

''نہیں بتا سکتی ہوں۔ جو میں نے دیکھا وہ کیا تھا؟ ایک چارپائی پر ایک آدمی اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ کیوں ہو رہا تھا۔ یہ مجھے پتہ نہیں تھا۔ نیچے زمین پر بھی ایک اور آدمی ننگا تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی اور وہ آگے پیچھے حرکت کر رہا تھا۔ اماں مجھے باہر لے گئی اور چند لمحوں بعد ہم یونہی کھڑے رہے۔ اماں نے بتایا یہاں کوئی میلہ لگا ہوا ہے۔ میلے میں کئی قسم کے تھیٹر۔ کئی قسم کے چڑیا گھر اور موت کا کنواں ہوتا ہے۔ تو پھر ہم اُس میلے کے خیموں کی طرف نکل آئے تھے جہاں وہ لوگ اپنے دن بھر کے کام کے بعد اب خیموں میں اپنے کچلے جذبات کو اُبھارنے کی اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ کیا یہاں روز ایسے ہوتا ہوگا۔ میں نے پیچھے سے مردوں کو اس طرح جھکے ہوئے حرکت کرتے پہلی بار دیکھا تھا اور مجھے ان کے نیچے

لیٹی عورتوں کی شکلیں بھی دکھائی نہ دیں کہ اماں نے آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دیئے۔ یہ سب میرے دماغ میں ہلچل مچانے کے لیے کافی تھا۔ اماں نے مجھے وہاں سے دھکا دیا اور ہم دوسرے خیموں کو باہر سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ کچھ میں روشنی تھی۔ کچھ میں اندھیرا تھا۔ کہیں سرگوشیاں تھیں۔ کہیں خاموشیاں ڈیرہ ڈالے تھیں۔ اُدھر پَو پھٹنے کے ساتھ ہی ہم شہر میں کنارے آ لگے۔ اب اماں نے شہر کبھی دیکھا نہیں تھا۔ معلوم بھی نہیں تھا کہاں دستک دینی ہے۔ شہر سویا ہوا تھا۔ انگڑائی لے کر جاگ رہا تھا۔ دودھ والے سائیکلوں پر نکلے۔ جھاڑو دینے والے منہ میں سگریٹ لگائے جھاڑو جیسے بالوں کے جھاڑ کو جھٹکتے ہوئے کام پر لگ گئے۔ کہیں کہیں اِکا دُکا بوڑھے اور وقت سے پہلے کمر جھکنے پر مجبور بزرگ لوٹے لیے قریب کی جھاڑیوں یا شہر میں پھنسے ہوئے کھیتوں یا کسی قابلِ اعتبار اوٹ کی طرف نکل کھڑے ہوئے تھے کہ خود کو دن بھر کے بوجھ سے ہلکا کر سکیں۔ پھر ذرا آگے گئے تو سکولوں کے بچے، کچھ تانگے اور کچھ سائیکل سڑک پر دکھائی دینے لگے۔ میرے لیے تو یہ سب ایک جادونگری تھی۔ ایک جادو پہ دوسرا جادو چڑھا ہوا تھا۔ ماں کا پتہ نہیں تھا کیا سوچ رہی ہیں۔ بس سڑک سے ملی سڑک پر نکلی جاتی تھیں، پھر یہ بھی ہوا کہ شہر سڑک پر آ گیا تھا۔ جس سے بچنے کے لیے ماں مجھے ایک طرف لے جاتی تھیں۔ دکانیں بھی اُدھر تھیں۔ اور کھل رہی تھیں۔ کہیں پر دودھ دہی والا بھی تھا جو اپنے کونڈے سجائے بیٹھا تھا۔ میں نے یہ سب کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس لیے میں بس دیکھتی رہی۔ اماں چادر لپیٹے چلتی رہی کہ ایک گلی میں اچانک اماں رُک گئی۔ مکان پر ایک لکڑی کی پلیٹ لگی تھی جس پر لکھا تھا:

''حاجی فرید بخش نظامی قوال انبالے والے۔''

اماں چند لمحے اُسے دیکھتی رہیں۔ میں نے پوچھا یہ کس کا گھر ہے۔ اماں نے بتایا یہ نام ہماری درگاہ پر عرس کے موقع پر بہت گونجتا تھا۔ میں زنانے میں بیٹھ کر پردے میں ان کی قوالی سنتی رہی ہوں۔ یہ ہماری درگاہ سے جُڑے ہوئے ہیں۔ اماں تذبذب میں تھی کہ

معلوم نہیں اندر کون ہوگا کیسا ماحول ہوگا۔ مگر کوئی اندر جائے یا نہ جائے۔ صبح کا وقت ہے چارہ نہ تھا۔ دستک دے دی۔ چند لمحے بعد اندر سے ایک جوان جہان لڑکی اوٹ میں آئی۔

''کون ہے۔''

اماں بولی ''حاجی صاحب گھر پر ہیں۔''

''ہاں مگر صبح پہنچے ہیں۔ رات ایک جگہ قوالی کی محفل تھی۔ اب تو سو رہے ہیں۔''

''اچھا..... ہم تو ملنے آئے تھے۔'' اماں نے مایوسی کے آخری لہجے میں کہا۔

''آپ کو کوئی ابا سے پروگرام کرانا ہے تو اندر آیئے۔'' وہ لڑکی بولی۔

اب اماں نے دیر نہ لگائی اور اندر کود گئیں۔ ساتھ میں مجھے بھی گھسیٹ لیا۔ اب جو اندر جاتی ہیں تو کیا دیکھتی ہیں۔ ایک چھوٹا سا صحن۔ ایک معمولی سا برآمدہ اور دو کوٹھے مطلب کمرے۔ اور باہر ہی چھپر کے نیچے کچن۔ مطلب باورچی خانہ اور ایک چھوٹی سی دو دیواریں جس کے اندر فراغت کے لیے بیٹھنے کی جگہ۔ ساتھ ہاتھ کا نلکا اور چوکا۔ بس یہ میں نے دیکھا۔

اب اماں جا کر کھڑی ہوئیں تو وہ لڑکی ماں کی طرف بھاگی۔ اندر سے ایک جھکی کمر کی بوڑھی عورت جو عمر سے تو بوڑھی نہیں تھی۔ مگر حالات نے بہت بوڑھا کر دیا تھا۔ باہر آئی اور حیرت سے دیکھنے لگی۔

''کون ہیں آپ لوگ۔''

''میں ہوں مخدوم علی قربان شاہ عرف بہار علی درگاہ والے کی اہلِ خانہ اور یہ اُن کی بیٹی ہے۔'' اماں نے اتنا کہا ہی تھا کہ تقریباً ایک چیخ مار کر اُس بزرگ خاتون نے ہائے ہائے کہا کہ آپ یہاں؟ کیا آفت آن پڑی۔ خیر گزری۔ کیسے بی بیاں یہاں باہر آ گئیں۔''

''وہ ایسا ہوا ہے کہ مخدوم صاحب کے گزرنے کے بعد ہماری گزران مشکل میں آ پڑی تھی ہم مجبوری میں بے پردہ ہوئی ہیں۔ حاجی صاحب کا نام پڑھا تو لگا درگاہ کا ایک

قوال ہے تو درگاہ کے رہنے والوں کو بھی جانتا ہوگا۔" اماں بولی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ ہمارے ہاں تو آپ کا لنگر چلتا ہے۔اب میں کیا کروں آپ کو بٹھانے کے لیے جگہ بس یہی ہے جہاں آپ کھڑے ہیں۔" وہ بے بس ہو کر بولی۔

اب اماں حیران ہوئی کہ ہم اندر نہ بیٹھ جائیں کسی کمرے میں۔"

"دو کمرے ہیں ان میں حاجی صاحب کے ساتھ اُن کے سازندے اور ہم نوا سوئے ہوئے ہیں۔رات کو پروعزام کر کے آتے ہیں تو ہم ان کمروں سے اٹھ جاتے ہیں اور اُن کو جگہ دیتے ہیں۔"

"باقی کا وقت وہ کہاں گزارتے ہیں۔" اماں کو تجسّس ہوا۔

"وہ یا سفر میں ہوتے ہیں۔ یا پروگرام کرتے ہیں یا درگاہوں میں کمر لگا لیتے ہیں۔"

"کیا ان کے اپنے گھر نہیں ہیں۔" اب کے میں بولی۔

"نہیں ہیں ان کے اپنے گھر۔ یہ دور دراز کے دیہاتوں سے آئے ہیں۔کبھی کبھی چھٹی پہ جاتے ہیں۔اکثر تو جاتے ہی نہیں ہیں۔بس تالی بجانا سیکھا ہے تو بے تالے نہیں ہوتے۔اپنے مرشد کے در پر متھا ٹیک کر پڑے رہتے ہیں۔

"تو اب ہم جاتے ہیں۔" اماں نے مایوس ہو کر کہا۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔وہ آپ کی درگاہ کا لنگر کھاتے کھاتے تو میری بیٹی جوان ہوئی ہے اور آپ مخدوم صاحب کی ڈیوڑھی ہیں۔ مطلب اُن کے زنان خانے کی عزت ہیں۔ایسے کیسے جانے دوں گی۔ حکم دیں۔ہم تو آپ کے مُریدوں کے مُرید ہیں۔مگر ہمارے گھر ایسے ہوتے ہیں۔" حاجی قوال کی بیوی اور کیا کہہ سکتی تھی۔

"ہم جائیں گے۔ نیند میں خلل پڑے گا۔سب سو رہے ہیں۔"

"مگر ہم تو جاگ رہے ہیں۔اے لڑکی جلدی سے موڑھے پیڑھی چوکی لا دے۔

ان کو بٹھانا ہے۔" اب کے وہ بے چین ہو کر بولی۔

حاجی قوال کی لڑکی بھاگی اور بیٹھنے کو کچھ چوکی پیڑھی لا دی۔ جس پر ہم دونوں ماں بیٹی بیٹھ گئیں اور کوئی گزارا چارہ نہیں تھا۔"

تو اب ہم بیٹھ تو گئیں۔ مگر آگے کا کوئی آسرا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ حاجی قوال کی بیوی کو اب اپنی پڑ گئی۔ جو چھوٹے سے دو کمرے تھے اور برآمدہ تھا۔ وہاں تو حاجی قوال کے سازندے اور ہم نوا ڈھیر ہو چکے تھے۔ میں یہ منظر دیکھنے کے لیے اُٹھی کہ لپک کر کمروں میں جھانکوں کہ ہم نوا اور سازندے کیسے ہوتے ہیں کہ حاجی قوال کی بیوی نے ٹوکا۔ "اے بی بی تم ہمارے مخدوم صاحب کی بیٹی ہو۔ کدھر جاتی ہو۔ اندر کمروں میں ہم نوا سو رہے ہیں۔ سویا اور مرا ہوا ایک برابر ہوتا ہے۔ کیا معلوم جسم سے چادر کھسک جائے تو بندے اور جانور میں کیا فرق رہتا ہے۔ چھوڑ دیوں سمجھو لاشیں زمین پر بکھری ہوئی ہوں گی۔" میں جست لگا کر دروازہ کھول چکی تھی۔ اندر ایک دوسرے پر گرے ہوئے ہم نوا، آپس میں گتھم گتھا لگتے تھے۔ ایک انچ جگہ نہیں تھی کہ کسی کا ہاتھ یا پاؤں کُھل کے آرام کر سکے۔ ایک جھلک میں لگا سب ایک دوسرے کی محبت میں چمٹے ہوئے ہیں۔ میں ابھی دیکھ ہی رہی تھی کہ حاجی قوال کی بیوی نے مجھے ہاتھ سے گھسیٹا اور دروازہ بند کر دیا۔ میرے جسم میں پتلا سانپ سرسرا گیا۔ اس کے بعد وہاں تو گنجائش ہی نہیں تھی۔ حاجی قوال جب بیدار ہوا تو اُس نے یہ سب سنا اور دیکھا تو بس یہاں سے ہماری قسمت بدل گئی اور یہ جو اَب میں ہوں یہ اُسی حاجی قوال کی وجہ سے ہوں۔ اللہ رسولؐ اور صوفیاء کا کلام سنانے والے قوالوں کی اپنی زندگی کن کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ اس کا مجھے کیسے علم ہونا تھا۔"

"تو اب پٹاری میں سے کچھ ڈھکن اُٹھا دو۔ ویسے مجھے تو معلوم ہے۔" امام بخش نے آخر کو صبر کے پیمانے سے آخری گھونٹ لیا۔

حاجی قوال تو خود کسی کا غلام تھا۔ وہ جو گویّوں اور قوالوں کو فنکشن لے کر دیتے

ہیں۔ ان کا مجھے پتہ نہیں تھا۔ آج ان کو پروموٹرز کہتے ہیں۔ منیجرز کہتے ہیں۔ ایجنٹ کہتے ہیں۔ عزت کے ساتھ بولیں تو وہ پرائیویٹ سیکرٹری بھی ہوسکتا ہے اور بھڑوا بھی ہوسکتا ہے۔ میں نے تو اُسے بھڑوا ہی پایا۔''

جہاں اُس جمال زادی کو پہنچنا تھا۔ وہ پہنچی۔ امام بخش اب ہمہ تن گوش تھا کہ ایک اور امراؤ جان ادا کسی گوہر مرزا کے ہاتھوں بے آبرو ہوئی۔ اب کہانی اپنے انجام کی طرف مڑ گئی۔

''حاجی قوال نے ہمیں اپنے اُس ایجنٹ کے حوالے کیا جو اُس کو مختلف جگہوں پر پروگرام کے لیے بک کراتا تھا۔ یہ ایجنٹ بہت پیسے والا لگتا تھا۔ اُس نے ہمیں ایک چوبارہ لے کر دیا۔ وہ خود معلوم نہیں کیا کاروبار کرتا تھا۔ اتنا بتاتا تھا کہ وہ یہاں سے فن کاروں، قوالوں اور شاعروں کو بیرون ملک بھیجتا ہے۔ ایک دن ہمیں بھی ولائت میں لے جائے گا اور ہماری زندگی بدل دے گا۔ میں نے ولائت کا کوئی تصور نہیں کیا تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ میرے سامنے کی دنیا کے علاوہ بھی کوئی دنیا ہے۔ وہ روزانہ فیشنی کپڑے پہن کے آتا تھا۔ اماں اور میرے لیے موسم کا پھل فروٹ لے کر آتا۔ اماں کو ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔ اماں سمجھتیں یہ سب حاجی قوال کی وجہ سے ہے جبکہ مجھے اُس کی آنکھوں سے کچھ اور معلوم ہوتا تھا۔ ایک اچھی بات اُس میں لگتی تھی کہ بہت شائستہ تھا، ندیدہ نہیں لگتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا یہ سب اُس کا کاروباری طریقہ تھا۔ وہ آتا تھا ادب سے کلام کرتا تھا پھر جو ہماری ضرورت ہوتی تھی اُس کا اُسے پہلے سے اندازہ ہوتا تھا جو وہ فوراً پوری کر دیتا تھا۔ سانولے رنگ میں نقش تو اچھے تھے ہی لباس کی پھبن بھی اپنا کام کر گئی۔ ایک دن اُس نے جال پھینکا۔''

اب امام بخش کی باری تھی کہ وہ سب سمجھ چکا تھا۔

''تو اُس نے موقع پا کر.....'' امام بخش بولا۔

''ہاں۔ اُس دن اماں کو اُس نے پڑوس میں ایک جہلم پہ بھیج دیا نہ اماں کو پڑوس کے مرنے والے کا پتہ تھا نہ اماں کسی پُرسے کے لیے تیار تھیں۔ وہ بس زبردستی اُس کے کہنے پر مان گئیں اور چلی گئیں کہ شاید پڑوس سے تعلق بن جائے۔ مگر تعلق تو وہ مجھ سے بنانا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ مرد عورت کو کیسے رجھاتے ہیں۔ پہلے کسی نے ایسا کیا نہیں تھا۔ اب اُس نے پہلے تو میری ایسی تعریفیں کیں کہ مجھے آئینہ دیکھنے کی حاجت ہوئی۔ مجھے تو شاعری کا علم نہیں تھا۔ پھولوں کے نام اور چاند ستاروں کے ذریعے اس نے تو مجھے پتہ نہیں کس کس سے ملایا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مجھ میں یہ سب باتیں ہیں۔''

''مردوں کے پاس ہر طرح کا آئینہ ہوتا ہے جو آپ دیکھنا چاہیں وہ اُس آئینے کو سامنے کر دیتے ہیں۔'' امام بخش معاملہ سمجھتا جا رہا تھا۔

''اب وہ اس تاک میں رہنے لگا کہ اماں ادھر اُدھر ہو اور وہ اپنا مدعا لے کر آ جائے اور پھر وہ سامنے آ گیا۔ اس نے مجھے شادی کے لیے کہا اور خوبصورت زندگی کا خواب دکھایا۔ اس نے بتایا کہ اس کی بیوی بیمار رہتی ہے اور وہ اس قابل نہیں کہ میرا ساتھ دے سکے اور وہ مجھے دنیا کے خوبصورت ملکوں میں لے جائے گا۔ گاڑی، کوٹھی، ملازم سب حاضر ہوں گے۔ مگر اس نے شرط لگا دی کہ ماں کو نہ بتاؤں کہ وہ نہیں چاہے گی کہ سونے کی چڑیا اُس کے ہاتھ سے جائے۔ اب میں سونے کی چڑیا تھی۔ جو اُس نے مجھے بنا دیا تھا۔ مجھ میں اتنی سمجھ کدھر سے آ جاتی کہ میں جو بے زمین و بے اماں تھی کسی بھی لہر میں بہہ سکتی تھی۔ سکول تو گئی تھی مگر کانونٹ سے آدھی ادھوری ہی نکلی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ اس آزمائش سے نکلوں گی تو دوبارہ سکول جا کر اپنی ہم جولیوں سے ملوں گی۔ خیال تھا یہ آزمائش جلد ختم ہوگی کہ اچانک میں ایک رات میں جوان ہوگئی۔ سکول اور ہم جولیوں کا تصور گہنا گیا اور ہاتھوں میں مہندی اور ایک بھرے پُرے گھر کا تصور آہستہ آہستہ پھیلتا گیا۔ دن بھر گم رہتی اور دماغ میں کسی کے آنے کی آہٹ میں سرسراتی رہتی۔ پھر وہ آ جاتا تو تسلی ہوتی۔ یہ ایسی کیفیت تھی

کہ جسے میں کسی بھی طرح سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ ایسے میں اماں مجھے گُم سُم دیکھ کر اکثر ٹوکتی کہ کہاں ہو۔ تمہیں کوئی سُدھ نہیں۔ کہاں گم ہو جاتی ہو۔ میں بہانہ بنا لیتی کہ ایسے ماحول میں کیا کروں، کیسے خود کو سکول کے تصور سے الگ کروں یا کبھی کبھی طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا لیتی تھی۔

ایک دن بس وہ دن ہی مجھے اس کوٹھے یا بالا خانے پر لے آیا۔ آخر کو امراؤ جان کا بھی ایک دن ہوتا ہے۔ وہ میرا دن تھا۔

اب امام بخش اونگھتے ہوئے بولا "مجھے تو معلوم تھا، داستان کو اغوا کر لیا گیا ہے اور داستان اب کسی اور کے نرغے میں آنے والی ہے۔"

"مگر آپ کو بے صبرا نہیں ہونا چاہیے۔ وہ داستان ہی کیا جسے اغوا نہ کیا جائے۔ جب سے داستان شروع ہوئی ہے۔ اغوا ہو کر کئی ہاتھوں میں آتی جاتی رہی ہے۔ بولیں کیا باغ و بہار اغوا نہیں ہوئی۔ کیا طلسم ہوشربا اور الف لیلیٰ ہر رات اغوا نہیں ہوتی تھی۔ ہر رات الف لیلیٰ کو شہزادا اغوا کر کے لے جاتی تھی۔ اس لیے وہ اُس کہانی کو ہزار راتوں میں لیے لیے پھرتی رہی۔" جمال زادی بولی "ہاں تم بھی ایسے ہی اغوا ہوئی جیسے کہانی اغوا ہوتی ہے۔" امام بخش مان گیا۔

"امام بخش عورت کو کہانی میں بدلنے کا تمہارے پاس اختیار نہیں ہے۔ عورت روزِ اول سے کہانی تھی اور کہانی ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ میں اب کہانی اور عورت کو روکنا نہیں چاہتا۔ بولو جو کہنا ہے۔" امام بخش نے دُہائی دی۔

"تو سنو۔ وہ مجھے ایک خواب دکھا کر اماں کی غیر موجودگی میں وہاں سے لے گیا کہ وہ مجھے راتوں رات فلم کی ہیروئن بنا دے گا۔ اس کام کے کے لیے میرا اُس کے ساتھ جا کر ڈائریکٹر سے ملنا ضروری ہے۔ مجھے تو کچھ بھی پتہ نہیں تھا۔ وہ پہلا مرد تھا جس کو میں نے

قریب محسوس کیا تھا۔ میں یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ مرد اور عورت آپس میں اکیلے ہو کر کیا کرتے ہیں۔ وہ مجھے لے گیا اور ایک بہت بڑے پھاٹک کے اندر گاڑی داخل ہوئی۔ میں نے تو بس درگاہ اور اس کے پاس اپنے گھر کو جانتی تھی۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جب پتہ چلا یہ ایک حویلی ہے۔ حویلیاں کیسی ہوتی ہیں۔ میں کیا جانتی۔ ایک آموں کا باغ راستے میں آیا۔ آم پہلی بار میں نے درخت پر لٹکتے دیکھے۔ کیا نظارہ تھا۔ میں تو دیکھتی رہ گئی۔ پھر مالٹوں کا باغ تھا۔ پھر کئی قسم کے بیل بوٹے۔ پھول پھلواڑی۔ سبز گھاس کے قطعے۔ لیموں کے درختوں پر لیموں لگے نہ ہوتے تو کیسے پتہ چلتا یہ لیموں کے درخت ہیں۔ اور اس طرح کے کئی پودے موجود تھے۔ وہ مجھے ایک خواب گاہ میں لے گیا۔ خواب گاہ کا تصور بھی میرے دھیان میں نہیں تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے پوچھا کہ یہاں کیوں آئے ہیں۔ اُس نے مجھے اپنے سینے سے لگا کر میرے ہونٹوں کو اپنے منہ سے بند کر دیا۔ کوئی ایسی خوشبو تھی جو میرے مساموں میں گھلتی جا رہی تھی اور پھر مجھے معلوم نہیں کیسے میرے جسم نے کینچلی بدل لی۔ اب وہ پہلے والا جسم نہیں تھا۔ وہاں تو صدیوں کا فاصلہ طے ہو چکا تھا۔''

''میں سمجھ گیا تھا۔ تمہیں روکنا مناسب نہ سمجھا۔ تاریخ میں عورتوں کے ساتھ یہی سلوک ہوتا رہا ہے۔ عورتیں اسے برداشت کر کے اپنے لیے نئے راستے تلاش کرتی رہی ہیں۔ تم بھی ضرور کسی دن اپنا راستہ لے لوگی۔'' امام بخش نے اپنا عاجزانہ تبصرہ پیش کر دیا۔

''تو پھر میری ماں کو پتہ چل گیا۔ مگر وہ مجھے کیا کہہ سکتی تھی۔ اُس کے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا کہ اُسے مخدوم قربان علی شاہ کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اور محض ایک نکاح کے کاغذ پہ وہی کچھ اُس کے ساتھ ہوا تھا جو میرے ساتھ ہوا تو پھر نکاح کا کاغذ کتنی بار بے توقیر ہوا ہوگا۔ صدیوں کی منزلوں میں یہ کاغذ کتنی بار تار تار ہوا ہوگا اور ایک کاغذ کی اوقات ہی کیا ہے۔ کاغذ میں اور عورت کی عصمت کے پردے میں کوئی فرق نہیں ہوتا امام بخش۔''

اب امام بخش کا ماتھا ٹھنکا کہ اس پردے میں کون بول رہا ہے۔ امام بخش تو ویسے

بھی کوٹھوں اور کوٹھیوں کے پردوں کے پیچھے کی کہانیوں کا سوداگر تھا۔ چاہتا تھا جمال زادی جلدی سے اس کوٹھے تک پہنچ جائے کہ وہ کیسے یہاں آئی۔

''پھر یہ ہوا کہ مجھے اُس کی عادت ہوگئی۔ وہ آتا اماں کو بہانے دے کر مجھے لے جاتا مگر اماں سب جان چکی تھی۔ وہ کیا کرسکتی تھی۔ اُس نے مجھے ایک دن سنگھار کرتے پکڑلیا اور چانٹوں سے میرا منہ لال کردیا۔ معلوم نہیں کتنے سالوں کا غصہ تھا اور کس کس کا غصہ تھا جو مجھ پر اُتر گیا۔ پھر معاملہ صاف ہوگیا۔ گویا یہ ہماری قسمت ٹھہری۔ لیکن ایک دن کیا ہوا؟''

اب پھر کہانی رک گئی۔ مگر جمال زادی فوراً رواں ہوگئی۔ اماں تو کب کی مری ہوئی روح تھی۔ نہ کوئی زمانہ نہ زمین۔ تو وہ اب کیا کرتی۔ مخدوم زادی یا جمال زادی بھی بے توقیر ٹھہری تو اُس نے جوانی کی آخری حد پر بڑھاپے کو قبول کیا۔ اب ایک دن جو ہوا وہ یہ تھا کہ اُس ایجنٹ نُما دلال نے مجھے ایک شام کسی بہت ہی امیر کبیر آدمی کے ساتھ کمرے میں جانے کا کہا تو اب میں نے اُس کے منہ پر ایک ایسا طمانچہ مارا کہ اماں کے مارے طمانچوں کی گونج اُس میں شامل ہوگئی۔''

''دلے تم نے ایجنٹ کا روپ لیا اور تم نے مجھے کئی طرح کے باغ دکھائے۔ مگر یہ نہ سمجھ سکا کہ مجھے اپنے جسم کی تجارت کا ہُنر تم سے اچھا آتا ہے۔ جو جسم ایک بار میلا ہوجائے اُس کو دُھونے کے لیے وقت لگتا ہے۔ تم نے اس کا انتظار ہی نہ کیا۔ اگر مجھے کاروبار کرنا ہے تو میں تمہارے دیئے ہوئے آسرے پر کیوں رہوں۔ اس تاجر سے اپنا سودا خود کیوں نہ کرلوں۔ ابے او تاجر زادے بول کیا ہے تیری جیب میں۔ اور تو کیا بیچتا ہے۔ اب اُس ایجنٹ کی پتلون گیلی ہوگئی۔ اور تاجر زادہ تو جیسے کاٹو تو لہو نہیں۔ میں نے کہا کیا ہوا مردانگی کے ٹھیکیدارو۔ تم عورت کو کتنا استعمال کرتے ہو۔ معلوم ہے کہ پلیٹ اور گلاس کو استعمال کرنا تمہیں آتا نہیں ہے اور تم چلے ہو عورت کو استعمال کرنے۔ سُنو بھڑوو۔ مرد جہاں ختم ہوتا ہے عورت وہاں سے شروع ہوتی ہے۔ یہ سب میرا پیدائشی حق ٹھہرا ہے۔''

امام بخش کہانی کو انجام دینے کے قریب تھا اور اُس نے سوال اٹھایا کہ ''تمہاری اماں کا کیا بنا۔''

اماں تو ویسے بھی بستر سے لگ گئی تھی۔ اب جو اُس ایجنٹ کو میں نے آڑے ہاتھوں لیا تو کوئی اور راستہ مجھے نہ سوجھا۔ سوچا جہاں بھی جاؤں گی میرا جسم تولا جائے گا تو پھر کیوں نہ ایسی جگہ پہنچوں جہاں میں اپنا جسم خود تول سکوں تو یہاں آ گئی۔ اماں کو ایک چارپائی پر ڈالا۔ اُسے کوئی بیماری نہیں تھی۔ میں نے اُس کی بیماری جاننے کی کوشش کی۔ کئی حکیم کہ کُشتہ بدست آئے۔ کئی معالج خضاب آلود آئے۔ مگر میری ایک آنکھ نے ان کو اُن کی اوقات اور راہ دکھا دی۔ اماں کی بیماری تو میں تھی۔ اب بیماری کا علاج بیماری سے تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اماں کو میں نے بتایا کہ دیکھو دکھیاری نہ بنو۔ تمہارا بدلہ بھی مجھے لینا ہے اور اپنا بھی تو طریقہ وہ ہوگا جو سکہ رائج الوقت ہے۔ اماں آنکھ کھول کر دیکھ لیتی تھی اور پھر آنکھیں موند لیتی تھی۔ جانتی تھی میں کیا کہہ رہی ہوں۔ دو چار کبوتر منڈیر اور روشندان میں پھڑ پھڑاتے تو اماں آنکھ کھول کر ان کو دیکھ لیتی کہ یہ فقیر کبوتر لٹھے ہیں۔ لٹھے کبوتر مزاروں پر ہوتے ہیں تو گویا اماں نے جیتے جی اس چارپائی کو مزار کے طور پر قبول کر لیا اور پھر کفن بھی تو لٹھے کا ہوتا ہے۔ سو لٹھے نے لٹھے کا سہارا لے لیا اور اماں بس لیٹے لیٹے گزر گئی۔''

اب امام بخش کی روح میں پھریری آئی کہ اتنا بڑا کردار یوں اچانک دنیا سے اُٹھ گیا اور قصہ گو نے کوئی گریہ ہی نہیں کیا تو امام بخش نے گریہ کیا اور کہا کہ شہر میں چمگادڑوں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ شہر میں جنازوں اور قبروں کا کاروبار عروج پر پہنچ گیا ہے۔ شہر میں گریہ کرنے والوں نے محرم کے علاوہ بھی اپنا کاروبار چمکا لیا ہے۔ اس لیے کرائے کے گریہ کناں مل جاتے ہیں۔ امام بخش نے گریہ کی روایت پر نوحہ گری کی اور جمال زادی کو شہر کی کینچلی بدلنے کا عندیہ دے دیا۔ لیکن ابھی شہر کے اِس زمانے کو ختم بھی ہونا تھا۔ کہ جمال زادی کو جس کا انتظار تھا اُسے آنا تھا۔ اب امام بخش نے اشارہ دیا اور امراؤ جان کو کسی گوہر مرزا، کسی

نواب سلطان یا کسی فیضو ڈاکو کا انتظار کرنا تھا۔ امام بخش اور انتظار نہیں کھینچ سکتا تھا۔ کوٹھے کی سیڑھیاں اُتر گیا اور سیڑھیوں میں پیش گوئی چھوڑ گیا کہ وہ آئے گا جس نے تمہیں یہاں تک پہنچایا ہے۔

یہ جو زمانے ہوتے ہیں یہ اَدل بدل کر آتے رہتے ہیں۔ لگتا ہے کوئی نیا دن طلوع ہوا ہے۔ ذرا دن سرکتا ہے تو معلوم پڑتا ہے یہ تو وہی تھا جو ابھی کل ہی گزرا ہے۔ لگتا ہے ایک ہی دن چلا جا رہا ہے۔ مگر یہ کیفیت امام بخش کی نہیں تھی یہ تو جمال زادی کی تھی۔ جس کو یقین تھا کہ مونی شاہ آئے گا۔ اُدھر ایک دُھوم مچی کہ کوئی شہر کی منڈیر پر چراغ بن کے جل رہی ہے۔ اور اندر سے آگ بن کے سُلگ رہی ہے۔ شہر کے چوباروں اور جھروکوں اور فصیلوں میں ممٹیوں پر چاند ماتھا ٹیک کر اُترنے لگا۔ شہر بھر کے عاشقوں کو نوید ہوئی کہ کوئی شعلہ رُو ماہ مثال اُن کے آزمانے کو موجود ہے مگر عاشقوں کی اوقات بس اتنی تھی کہ نیچے کھڑے ہو کر جھروکوں سے جمال زادی کے آنے کا انتظار کریں یا محرم کے عشرے میں سیاہ پوش شعلہ صفت اور ماہ پیکروں کو گریہ وزاری میں مبتلا جلوس کی شکل میں دیکھیں۔ اب ایسے میں خبریں تو مونی شاہ تک پہنچ رہی تھیں کہ وہ جو عالم میں حُسنِ چہار آئینہ ہے اور مثلِ ہفت آسمان ہے کہ آسمان پہ چاند ہے اور چاند پر پریاں رہتی ہیں، تو مونی شاہ کہ حجروں اور غلام گردشوں میں پَلا بڑھا تھا اور آستانوں کی محفلوں میں ٹھٹھے ٹھٹھول میں تربیت شُدہ تھا۔ اُس نے اپنے ارادت مندوں، حاشیہ برداروں، لنگر خانے کے پروردہ لشکریوں کی زبانی جب سنا کہ رئیسوں کی خدمت کے لیے کسی اعلیٰ حسب نسب کی اصلی نسلی خون سے جُڑی ہوئی کوئی ضرور غلام گردشوں کی پیدائش ہوگی جو یوں شہر کے نامی گرامی بالا خانے کے جھروکے میں شمع بن کے طلوع ہوئی ہے۔ اور کسی نے جانے کیا سوچ کے اس سڑک کا نام نشاط روڈ رکھ چھوڑا تھا۔ اب جو حسب نسب اور خاندانی ناک نقشے کی بات سُنی تو اشتیاق ہوا کہ اپنی خاندانی ساکھ کا سکہ ٹھنٹھنایا جائے۔ عام طور پر عورت کے حسن کی دہشت میں یہ سکہ وقت پر کم ہی ٹھنٹھناتا

ہے اور بس اپنی اوقات لپیٹ کر دبے پاؤں واپسی کی سیڑھیاں اُتر جایا کرتا ہے۔

اب جب مونی شاہ نے ٹھان لی تو اپنی رانوں میں اپنا سکّہ سنبھالے خاندانی گاڑی میں ذرا دبے پاؤں ہی نکلا۔ نشاط روڈ اُس کے لیے اتنی اجنبی نہیں تھی کہ ایک دوبار تماش بینی کی ہوس میں عین عاشورے کے روز سیاہ پوش کوٹھے دارنیوں کے دیدار کے لیے آ چکا تھا۔ اب اپنے خاص گماشتے کے ذریعے کہ جو درگاہ کے لنگر کا مہتمم تھا اور اکثر اخراجات میں خُرد بُرد کا پرانا فنکار تھا۔ وہاں داخل ہو گیا۔ سیڑھیوں پر اُس کے انتظار کا وقت منجمد ہو چکا تھا۔ اور پھر وہی ہوا جو جمال زادی کی خواہش کے عین مطابق تھا۔ ایک پردہ سا لگا دیا گیا تھا۔ کہ جمال کی تپش سے مونی شاہ کو پسینہ نہ آ جائے۔ اب مونی شاہ کہ حویلیوں کی راہداریوں، غلام گردشوں اور برآمدوں کی اوٹ میں اپنے جیسے کھیل کھیلتا ہوا بڑا ہوا تھا۔ اتنا تو جانتا تھا کہ اندر کی طلب بندے کو دیوانہ کر دیتی ہے۔ شکاری کو اس کا نشانہ گمراہ کرتا ہے۔ جب اُس کا نشانہ ہدف پر صحیح بیٹھنے لگ جائے تو وہ پھر راستوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ جنگلوں جنگلوں بھٹکنا اُس کا مقدر ٹھہرتا ہے۔ اب یہی تو مونی شاہ کے ساتھ ہوا۔ وہ ایسا بھٹکا کہ اِدھر آ نکلا۔ اب آگے بند گلی تھی۔ مونی شاہ نے جب یہ مجلس کا مزاج دیکھا کہ بیچ میں نہ کوئی واسطہ نہ کوئی بزرگ رشتہ نہ کوئی خادمہ نہ کوئی نائیکہ نہ میوہ نہ شیرینی۔ پردہ بھی ایسا کہ حُسن کو جِلا بخشے۔ کچھ لمحے مونی شاہ کو جائزہ لینے میں لگے۔ پردے کے پیچھے جمال زادی آ کر روبرو بیٹھی۔

''آپ کی سواری لگتا ہے دور سے آئی ہے۔''

''بس یوں سمجھ لیں۔ آپ کی شہرت جتنی دور جا سکتی تھی۔ اتنی دور سے آئے ہیں۔''

مونی شاہ کو کلام کا راستہ مل گیا۔ ''لگتا ہے کچھ دل سے دل کو راہ ہے یا کوئی پرانا حساب ہے جس نے یہ سبب بنایا ہے۔'' اب جمال زادی باتوں کی بساط پہ اُس کو

لانا چاہتی تھی۔

"بس یہ تو ایسا ہے کہ بلاوا آتا ہے تو پاؤں رکاب میں آجاتا ہے۔ آپ کی کشش سے لہو میں دھمال محسوس ہوئی تو دیر نہیں کی آنے میں۔" مونی شاہ لگتا تھا ساری منزلیں جلدی سر کرنا چاہتا ہے۔

"دھمالیں آپ نے دیکھی ہیں۔ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔"

"خانوادہ ہے ہمارا ذرا پیری فقیری اور گدی نشینی کا۔ مگر ہم مجبور ہو گئے یہاں آنے کے لیے اور دھمال تو بندے کو چاروں سمتوں سے گھیر لیتی ہے۔"

مونی شاہ اپنے بزرگوں کی روح کا دامن تھامے ہوئے اپنے آنے کا جواز بنا رہا تھا اور جمال زادی اُس کے ساتھ ایسے کھیل رہی تھی جیسے بلی معصوم چوہے سے کھیلتی ہے جسے کھانا چبانا مقصود نہیں ہوتا۔ بس ایک ادھورا پنجا مار کر تماشا دیکھتی ہے۔

"ہم نہیں پوچھیں گے کہ کس آستانے اور کس درگاہ عالیہ سے آپ کا تعلق ہے۔ خود ہم بھی مُرشد زادوں کی خدمت کو اپنے لیے فخر کی بات سمجھتے ہیں۔"

"تو پھر واقعی ہمارا آپ سے کوئی پُرانا تعلق ہے۔ ایسا ہے کہ درگاہوں پر دُکھی لوگ آتے ہیں۔ پریمی آتے ہیں۔ منت مُراد کی چادریں لاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے آپ بھی کسی کے پریم میں اُدھر سے گزری ہوں۔" مونی شاہ نے گویا ایک پتّا پھینکا کہ شاید جمال زادی پریم کی بھاشا سے مائل ہو کر پگھل جائے اور اگلے مراحل آسانی سے طے ہو جائیں۔

لیکن جمال زادی تو ابھی اور چوہے سے کھیلنا چاہتی تھی۔

"ہمارا پریم کیسا اور کیسی ہماری یاری۔ ہم تو بس بیلے کی خوشبو ہیں جدھر کی ہوا ہوگی اُدھر کو گزر جائیں گے۔" جمال زادی نے پتا پھینکا۔

"تو پھر بیلے کی خوشبو ہم تک پہنچ گئی۔ اس لیے تو ہم آئے ہیں۔"

اس پر جمال زادی کو موقع مل گیا اور اب کے جو پتا اُس نے پھینکا وہ شاید اُس کی

تاش کا یکّہ تھا۔ ''تو صاحب آ ہی گئے ہو تو کیا مال منال لائے ہو۔ کون سے ہار ہیرے اور باغ بغوچے لائے ہو۔''

''وہ تو آپ کے حکم سے طے ہوگا کہ آپ کا جلوہ اور اُس کی تاثیر سے ہم مالا مال تو ہوئے نہیں۔'' یہ مونی شاہ کا اوچھا وار تھا جو ہونا ہی تھا۔

''تو گویا آپ ایسے سوداگر ہیں کہ پہلے مال کے کھرے ہونے کا یقین چاہتے ہیں۔''

''اس لیے کہ ہم خود کھرا مال ہیں۔ چاہو تو شجرہ نسب دیکھ سکتی ہو۔''

''طوائف اور رنڈی کسی بیوپاری کا شجرہ نسب نہیں دیکھتی۔ وہ تو اُس کی اوقات دیکھتی ہے۔ منہ میں کتنے دانت ہیں یہ دیکھتی ہے۔ جسم پر کتنا ماس ہے وہ دیکھتی ہے۔ کھیسے میں کیا دبا کے لایا ہے وہ دیکھتی ہے۔ اور سنو صاحب رنڈیوں اور طوائفوں کے بھی شجرہ نسب ہوتے ہیں۔ اگر نہیں پتہ تو دنیا میں رنڈی خانوں، چکلوں، کوٹھوں اور بالا خانوں کے روزنامچے نکلوا کے دیکھ لو۔ معلوم پڑے گا۔ کون سی ٹھسے دار طوائف کس بادشاہ کی بیٹی تھی۔ کون سی ڈیرہ دارنی کس جاگیردار کی حویلی سے تھی اور کون سی رنڈی کس سجادہ نشین کی درگاہ کی غلام گردش سے تھی اور ہاں یہ بھی سن لو۔ پاکستان کے ایک سیاسی سجادہ نشین نے ایک گانے بجانے والی سے خفیہ شادی کی۔ اور پھر اُس سے جو بیٹی ہوئی۔ معلوم ہے وہ کون ہے۔ یہ میں نہیں بتاؤں گی۔ اب بولو تم کون ہو۔''

اتنا بڑا بیان سن کر مونی شاہ تو جیسے کاٹو تو لہو نہیں۔ مگر آخر لہو کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر آیا تھا تو اُس نے سوال کر دیا۔

''پہلے تم بتاؤ تم کون ہو۔''

''میں نے اگر بتا دیا تو مشکل ہو جائے گی۔ میں نے بہت انتظار کیا ہے اس وقت کا۔ اب تم میرے کوٹھے کی عزت کرو اور اپنا آپ ظاہر کرو۔ بولو میرے لیے تمہارے

پاس کیا ہے۔"

"اگر تم نے اپنی قیمت ہی لگالی ہے تو پھر تم ہی بولو۔ کیا چاہیے۔"

"مجھے جو چاہیے کیا تم دے سکتے ہو۔"

"شاید میں دے سکتا ہوں۔ بولو کیا زمین آسمان تو نہیں مانگو گی۔"

ہاں اپنی زمین اور آسمان تو مانگوں گی۔"

"کیا ہے تمہاری زمین اور آسمان؟"

"تم دے نہیں سکو گے۔"

"پھر بھی بتاؤ تو سہی۔"

"مجھے پوری درگاہ چاہیے۔ پورا آستان چاہیے۔ پوری جاگیر چاہیے جس کی میں حقدار ہوں۔"

"تم کون ہو۔"

"میں کچھ بھی نہیں۔ صرف مخدوم علی قربان شاہ عرف بہار علی کی بیٹی ہوں اور تم کون ہو۔ بولو۔"

اب مونی شاہ کے کاٹو تو لہو نہیں اور پردہ ہٹا کر جمال زادی سامنے براجمان ہوگئی۔ اب مونی شاہ میں کیا دَم کہ بولے۔ سامنے بہن بیٹھی تھی۔ جو حال اُس کا ہوا وہ صرف سعادت حسن منٹو سمجھ سکتا تھا جس نے "ٹھنڈا گوشت" افسانہ لکھا تھا۔ آج وہ افسانہ ایک اور معنی دے رہا تھا۔ یہ تاریخ نے رقم کرنا تھا۔ بپھری شیرنی کی طرح جمال زادی سامنے کھڑی تھی۔ اور بولی "مونی شاہ آؤ سامنے خواب گاہ ہے آؤ پیسے جمع کراؤ اور مجھے اپنی آغوش میں لے لو۔ پیسے نہیں ہیں تو سیڑھی سے نیچے ندامت اوڑھ کر اُتر جاؤ جو تمہارے لیے بہتر ہے۔ اور اگر میری ماں کا پوچھنا ہے تو وہ میری وجہ سے مر چکی ہے کہ میں نے ہی اُسے وہ دُکھ دیا کہ وہ میرے نانا کے بڑھاپے کا سہارا بنے بغیر ایک فضول سی کھردری چارپائی پر

گزر گئی۔اب مجھے میری ماں لا کر دو جسے تم نے محروم کر کے مخدوم علی قربان شاہ کو قتل کرانے کے بعد حویلیوں سے نکال دیا یا آؤ اپنی بہن کے ساتھ ہم بستری کرو۔اس گناہ کے لیے میں تیار ہوں کیونکہ یہ ارادہ تم کر کے آئے ہو۔آؤ یہ گناہ اپنے سر لے لو۔''

اب جو دیکھا تو سامنے کوئی نہیں تھا۔وہ کب کا جا چکا تھا۔کب وہ سیڑھیاں اُترا۔ کب وہ اپنی ٹانگوں پر چلا۔کب وہ کسی تانگے یا موٹر میں بیٹھا کسی کو علم نہیں۔تاریخ اور امام بخش اِس سے بے خبر ہیں۔حالانکہ کوئی بے خبر کسی بھی حادثے سے بے خبر نہیں ہوتا۔

امام بخش تو وہ اللہ دین کا جِن ہے جو کسی بھی قصہ گو کے پاس ہوتا ہے۔ایسا ہی ہوا کہ امام بخش حاضر ہو گیا اور جمال زادی نے پوچھا۔

''امام بخش کیا میں نے غلط کیا۔''

''تم نے مگر ایک غلط کام کیا۔''

''کیا؟''

''تم نے موتی شاہ کو جانے کیوں دیا۔''

''وہ گیا نہیں تھا۔وہ بھاگ گیا تھا۔''

اب امام بخش نے جمال زادی کے سامنے سوال رکھ دیا تھا جس کا جواب اُس نے دے دیا تھا۔اب اُس شہر کی کتھا تو سامنے آ گئی تھی۔مگر ابھی کتھا کے کچھ پہلو سامنے آنے تھے۔جمال زادی نے بالا خانے کو خیر باد کہا اور اپنا حق حاصل کرنے کے لیے جمال زادی سے مخدوم زادی بننے کی طرف پہلا قدم اُٹھایا۔اُسے موتی شاہ پر اخلاقی فتح تو حاصل ہو چکی تھی۔اپنے باپ کا قاتل ثابت کرنا تو شاید مشکل تھا۔البتہ خود کو مخدوم زادی ثابت کرنے میں کچھ کامیابی کے امکان موجود تھے۔اگر چہ نہ اب مخدوم علی قربان شاہ زندہ تھا نہ جمال زادی کی ماں زندہ رہی تو ایسے میں نکاح خواں اور نکاح کے کاغذات کسی حد تک آخری امید بن سکتے تھے۔مگر یہ لمبا سفر تھا۔کتھا کے تھک جانے کا امکان تھا۔سو امام بخش نے کوچ کا

نقارہ بولا۔البتہ اتنا ضرور کہا کہ جمال زادی انصاف لینے کے لیے تمھیں جن وکیلوں، ججوں اور سرکاری عمّال کے دروازوں پر دستک دینی پڑے گی وہ تمہارے بدن کو ٹکسال میں ڈھال لیں گے۔ جمال زادی مسکرائی کہ بدن کا سکّہ رائج الوقت میرے پاس ہے جسے اب سوچ سمجھ کے استعمال کروں گی۔

امام بخش نے آسمان کی طرف دیکھا۔ یہ اُس شہر میں آندھیوں کے دن تھے۔ اُسے پرندوں کی طرح پہلے سے علم ہو جاتا تھا کہ آندھی آ رہی ہے۔اب یہ بھی اُسے معلوم ہونے لگا تھا کہ آندھی سُرخ ہے یا سیاہ۔ جونہی وہ بازار میں نکلا آندھی نے آلیا۔امام بخش جانتا تھا کہ جو آندھی اٹھی ہے وہ کتنی طاقتور ہے اس لیے وہ چہرے کو اپنی پگڑی سے ڈھانپ کے نکلا۔مٹی اور ہوا کا ایک ایسا ریلا آیا کہ سب کچھ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ باغوں میں آم کے بُور آنے کا موسم ہوتا ہے۔ بُور آ چکے تھے۔اور کہیں کہیں آموں کی کیریاں بھی پُھوٹ رہی تھیں۔اُس نے دعا کی کہ کوئی زندہ گدھا زمین میں دفن کردے تو یہ آندھی خون کا خراج لے کر ختم جائے۔مگر اُس دن ایسا نہ ہوا۔ بقول ایک بزرگ آج کل کے گدھوں میں بھی برکت نہیں رہی۔ جونہی امام بخش گھر پہنچا اُسے بخار نے آلیا۔سات دن بخار اُترتا اور چڑھتا رہا۔کسی نے اُسے باری کا بخار کہا۔کسی نے اُسے تپِ محرقہ سے تعبیر کیا۔کوئی بولے کہ یہ ہڈیوں کو گھلانے والا بخار ہے۔مگر امام بخش کو خواب آیا کہ سات دن رات سُرخ اور سیاہ آندھیاں چلتی رہیں گی۔آموں کے باغوں سے بُور جھڑ جائے گا۔اُس سال کسی آم کے درخت پر آم نہیں لٹکے گا۔اور آندھیوں کے بعد زور کی برسات آئے گی جو دریاؤں اور نہروں کو کاٹے گی۔زمین کا کٹاؤ ایسا ہو گا کہ بستیاں دریا بُرد ہو جائیں گی۔مویشی پانی میں بہہ جائیں گے۔امام بخش کا خواب سچا ہوا اور شہر کے مضافات کچلے گئے۔شہر آفت کا شکار ہوا۔ جو اونچی آبادی پر تھے۔ وہ نشیب کو دیکھ رہے تھے۔ جو نشیب پر تھے وہ ماتم کر رہے تھے۔یہ سب صدی میں ایک بار ہوتا تھا۔یہ بات امام بخش نے تاریخ کے ایوانوں کو کھنگالنے

کے بعد بتائی تھی۔

اب ایسا ہوا کہ کوئی نہیں جانتا کہ اس طرح کے شہروں پر حملہ آور کیوں کُود پڑتے ہیں یا اس طرح کے شہروں پر اوران کی زمینوں پر کون قابض ہو جاتے ہیں۔ مگر ایک بات تو امام بخش بھی جانتا تھا کہ کسی پر قابض ہونے کا اولین نسخہ ایک ہی ہوتا ہے کہ وہاں کے رہنے والوں کی زبان سیکھو اور پھر افغانیوں اور ایرانیوں نے اُس شہر کی زبان سیکھ لی۔ زبان کے سہارے اپنا آرٹ، اپنا کلچر، اپنا آرکیٹیکٹ اور اپنے کھانے متعارف کرادیئے۔ تو ثابت ہوا کہ زبان ہی وہ راستہ ہے جو کسی بھی قوم کو اپنا بنا سکتا ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اُس شہر میں کئی دروازے تھے۔ ہر دروازے کے اندر بازار تھے۔ ہر بازار کے بازو میں کئی گلیاں تھیں اور ایک گلی میں کئی گھر تھے۔ یہ ایسا گورکھ دھندا تھا کہ امام بخش نے ایک کہانی اور پیدا کر لی۔ کہانی یہ تھی کہ اُسی بازار کی ایک گلی ہے جسے زرگری میں مہارت حاصل تھی۔ وہ سب اس گلی میں آباد ہو گئے اور کوچہ زرگراں کے نام سے شہرت پائی۔ زرگری کی پوری تاریخ ہے جو زمانہ قبل مسیح سے بھی پہلے کے چین اور مصر کے گم نام زمانوں سے ہو کر گزرتی ہے۔ ایسے میں یہ شہر بھی کسی سے کم تو نہیں تھا اس کی تاریخ نے بھی کئی قصوں کو جنم دیا۔

امام بخش تاریخ کے اساطیری زمانوں کی بِھنک رکھتا تھا۔ اور زرگری کی تاریخ کو اپنے شہر میں قدیم تاریخ سے جوڑنے میں بہت مزہ لیتا تھا۔

چمک زر کی اُسے آخر مکانِ خاک میں لائی
بنایا ناگ نے جسموں میں گھر آہستہ آہستہ

امام بخش کو معلوم تھا ناگ زر کی دیگ پر کیسے پہرہ دیتا ہے اور اُس کو کس منتر سے کیل کرنا ہوتا ہے اُس کا بھی اُسے علم تھا۔ اب کوچۂ زرگراں کی کہانیوں نے اُس کے اندر غدر مچا دیا۔ ہر کہانی ناگ کا سرا نکال کر پھنکارتی تھی کہ مجھے لکھو۔ اب کس ہاتھ نے کس نازک کلائی کو چوڑی پہنائی تو روح تک اُس کی تاثیر کیسے پھیل گئی۔ یہ تو معمول کے قصے

تھے۔سونے میں تلنے والی حسینائیں زرگروں کے ہاتھوں کتنی سستی تولی گئیں یہ تو امام بخش کسی کو بتانے پر تیار نہ ہوا۔اب کوچۂ زرگراں میں کئی کہانیاں نکلیں۔مذکور اُن کا یہاں مقصود نہیں ہے مگر امام بخش کی تسلی کے لیے ہوسِ زر کے کچھ واقعات امام بخش نے واقفِ حال و ماضی احباب کی خدمت میں پیش کر دیئے۔

اس کوچے میں مکان در مکان ملحق دیوار بہ دیوار اور دکان در دکان کی بالشت بھر کا فاصلہ قرینِ قیاس ٹھہرے۔گلی ایسی کہ کھوے سے کھوا چھلے۔بازو سے بازو ٹکرائے۔سانس سے سانس بھڑ جائے۔نگاہ سے نگاہ لڑ جائے۔بس یہ بات امام بخش کے لیے کہانیوں کے ان گنت سلسلوں کو جنم دے رہی تھی۔جس کا وہ متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔اس لیے اُس نے دو ایک کہانیوں کو پکڑا۔

اس گلی کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا چار منزلہ مکان تھا۔مکین جن کے اسی زرگری کے پیشے سے جُڑے ہوئے تھے۔کاری گری کی تہمت اُٹھائے پھرتے تھے۔وگرنہ نان و نفقہ بس اتنا کہ گلی کے آلو چھولے یا دال مونگ بڑ کے پتوں پر دھرے دُونا بنا کے گھر لاتے اور سونے کے خواب دیکھتے۔دن بھر طلائی زیورات کو ٹانکے لگاتے اور سونا پگھلاتے گزر جاتا۔وہ بھی ایک قبر نما حجرے میں آلتی پالتی مار کے بمشکل تین کاریگروں کی جگہ بنتی تھی۔مختصر سے اوزار رکھے دن بھر جُتے رہتے تھے۔ایک شب کسی مکین کو خواب آیا کہ وہ جس جگہ سوتا ہے اُس کے نیچے کسی قدیم زمانے کا دفینہ موجود ہے۔ایک دیگ میں سُونا چھپا کے رکھا گیا تھا۔زمین کھود کر اُسے نکالو۔یہ خواب مسلسل تین چار راتوں کو آتا رہا۔اب خواب،سراب،واہمے،التباس اور فریب میں کیا فرق ہوتا ہے۔اس کا مذکور یہاں مناسب نہیں۔صاحبِ خواب کو یقین ہو گیا کہ اس قدیم ترین شہر میں کچھ بعید نہیں کہ واقعی دفینہ موجود ہے اور اُسے بشارت مل رہی ہو۔سو اُس نے یہ خواب گھر کے دیگر مکینوں کو سنایا۔سب کی آنکھوں میں سونے کی چمک نے گھر کر لیا۔اور وہ گھر کھودنے پر اُتر آئے۔ایسا

انہوں نے قصوں میں سنا تھا۔ کئی قسم کی اساطیر میں تذکرہ ہوا تھا اور سینہ بہ سینہ کہانیوں میں یہ سب موجود تھا اس لیے اسے کسی نے انہونی نہیں سمجھا۔ اب فیصلہ یہ ہوا کہ دن بھر کھدائی کی جائے اور رات کے اندھیرے میں مٹی ٹھکانے لگائی جائے تا کہ کوچے کے کسی اور گھر کو شک نہ گزرے۔

اب ایسا ہوا کہ دن بھر وہ کھدائی کرتے اور یاجوج ماجوج کی طرح محسوس کرتے کہ بس ایک بالشت کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ صبح اٹھ کر اُسے عبور کرلیں گے۔ اب ذرا آرام کرلیں۔ یاجوج ماجوج بھی یہی سمجھتے تھے کہ دیوار چاٹتے چاٹتے شام ہوگئی ہے اور دیوار کاغذ جیسی پتلی رہ گئی ہے۔ صبح اُسے چاٹنا کیا مشکل ہوگا۔ وہ سو جاتے۔ مگر صبح دیکھتے کہ وہ دیوار پھر سے موٹی ہوگئی ہے۔ وہ پھر چاٹنے لگتے۔ ایسے ہی وہ بھی اگلے دن پھر کھودنے لگتے۔ مگر کوئی کُدال کسی دیگ سے لگ کر نہ ٹھنٹھنائی۔ اس طرح کئی دن گزر گئے۔ اب وہ پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتے تھے کہ کہیں منزل کے قریب پہنچ کر نہ پلٹیں۔ اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ پانی رِسنے لگا۔ زمین دلدل میں بدلنے لگی۔ یہی وہ مقام تھا جہاں اس قدیم مکان کی بنیادوں پر کاری ضرب لگی اور یہ قدیم چار منزلہ عمارت زمین بوس ہوگئی۔ اپنی کھودی ہوئی قبر میں دفینے کا راز سینے میں لے کر سو گئے۔

امام بخش ایسی کئی اور کہانیاں بھی جانتا تھا۔ کوچۂ زرگراں میں ایسے پراسرار لوگ بھی تھے جو سونا بنانے کے کیمیائی عمل کے نسخوں کی جستجو میں لگے رہتے تھے۔ امام بخش کو بھنک پڑی کہ ایک دو کو یہ نسخہ کسی قدیم دستاویز میں مل بھی چکا ہے۔ جو دستاویز کسی قدیم دفینے سے برآمد ہوئی تھی اور اُس پر عمل کرتے ہوئے ایک آنچ کی کسر سے نامراد ٹھہرے لیکن اب بھی کسی نہ کسی گھر سے اطلاع آتی کہ سونے بنانے کا عمل جاری ہے۔

امام بخش کسی ایک کوچے کا راز دان نہیں تھا۔ وہ کسی ایک پتھر یا اینٹ سے سر ٹکرانے کا قائل نہیں تھا اُسے شہر بھر سے کردار اور کہانیاں جمع کرنے کا لالچ تھا۔ وہ تو کسی

ایسی بھکارن سے بھی چپک جاتا تھا جو نوجوان ہوتی تھی کہ اُسے اُس میں سے بھی کہانی ملنے کی امید ہوتی تھی اور کہانی مل بھی جاتی تھی۔ وہ سعادت حسن منٹو سے بھی آگے کی روح تھا۔ مطلب بہت ڈھیٹ تھا۔ امام بخش کو اپنے شروع کے ساتھی اچانک یاد آئے۔ جن میں منصور مہان، احمد نواز انقلابی، مقبول چغتائی، من ٹھار پردیسی، تشنہ ترابی، فراز عارفی اور شوق صدیقی شامل تھے جو امام بخش کے چائے خانوں کے ساتھی تھے۔ اُس نے سوچا میں اُن سے کیوں الگ ہوگیا۔ الگ شاید نہ ہوا۔ وہ سب اپنے اپنے خوابوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے شہر کے اطراف میں بھٹکتے رہے اور امام بخش اُن کے پیچھے نہ بھاگ سکا۔ احمد نواز انقلابی کو عشق ہوگیا۔ زمینداروں کی ایک خوبصورت لڑکی سے جو تازہ تازہ مارکسزم پڑھ کر خود کو ڈی کلاس کرنے کی نقل اُتار رہی تھی۔ اُس نے احمد نواز انقلابی سے خوب لاڈ کرائے نخرے اٹھوائے۔ اور جب اُس کے خوابوں کا شہزادہ مرسڈیز میں بیٹھ کے آیا تو وہ سارا انقلاب بھول کر روانہ ہوگئی۔ انقلابی زخم چاٹتے ہوئے عیسیٰ خیلوی کی کیسٹیں سن کر زخم تازہ کرتا رہا۔ مقبول چغتائی سعودی عرب نوکری کے لیے نکل گیا۔ واپس آیا تو لمبی داڑھی میں کسی نے پہچانا ہی نہیں۔ بس جو کما کے لایا تھا وہ دکان میں لگایا اور گلّے پر بیٹھ گیا۔ ہر گاہک خاتون کو ماں بہن سمجھ کر دیکھنے کی عادت ڈال لی۔ من ٹھار پردیسی کو افیون، چرس اور متفرق نشہ جات نے آغوش میں لے لیا۔ اکثر مشہور گلوکار پٹھانے خان کے تکیے پر قبرستانوں میں دکھائی دے جاتا تھا۔ تشنہ ترابی کو شاعری میں اپنی مرضی کے مقام نہ ملنے کا غم کھا گیا اور وہ ہوا میں اردو کی سنہری شعری روایات کو مغلظات سے نوازنے میں مصروف رہنے لگا۔ فراز عارفی اور شوق صدیقی شہر میں نوجوان خواتین شاعرات کی ناگہانی شادیوں پر اُداس اور مغموم رہنے لگے جس سے ان کی غزلوں پر فانی بدایونی کی غزل کے گہرے اثرات نظر آنے لگے۔

اب امام بخش نے آسمان کی طرف دیکھا تو اُسے فضا میں بے وفائی کے اشارے

ملے۔ لگتا تھا ایسی ہوا چلنے والی ہے کہ شہر کینچلی بدل لے گا۔ شہر کی تبدیلی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ پہلا اشارہ یہ ملا کہ شہر کے قدیمی چائے خانے، دہلی مسلم ہوٹل کا بند ہونا اور اُس میں کپڑے کی دکان کے قائم ہونے کا واقعہ سامنے آیا۔

باب سوئم

امام بخش تاریخ اور قصہ گوئی کی روایت کو اوڑھ کے سو گیا۔ معلوم نہیں وہ کب تک سوتا رہا۔ کتنے قرن کتنے زمانے کتنے یُگ بیت گئے۔ وہ سویا رہا۔ وہی اُس کا حجرہ کتابوں سے بھرا ہوا۔ وہی اُس کی کھاٹ۔ وہی اُس کا چوبارہ اور اُس کا جھروکہ جہاں سے وہ بازار کی چہل پہل۔ رونق اور گہما گہمی کو دیکھتا رہتا تھا۔ مگر اُس نے منقار زیر پر ڈال دی اور شہر کے منظرنامے سے اچانک غائب ہو گیا۔ مگر جب پانی زمین پر غائب ہوتا ہے تو نیچے کہیں جا گزیں ہو کر پھر سے باہر آنے کے لیے ریت میں سرایت کر کے اوپر کسی کمزور مٹی سے باہر آنے کی تگ و دو کرتا ہے اور باہر آ جاتا ہے۔ ایسا ہی امام بخش کے ساتھ ہوا کہ وہ معلوم نہیں کب تک سوتا رہا۔ شہر بدل گیا۔ ہوا بدل گئی۔ مزاج بدل گیا۔ ہزاروں سال کے شہر کا مزاج اور ہوا بدل جائے تو یہ تو بڑا واقعہ ہوتا ہے۔ مگر ہو گیا یہ واقعہ اور امام بخش سویا رہا۔ تاریخ سو جاتی ہے یہ تو امام بخش تھا۔ قصہ گو کو آنکھ لگ جاتی ہے اور پھر سب سے آخری قصہ گو میر باقر علی کو نیند آ گئی تھی اور جب وہ جاگا تو نئے زمانے کے قصہ گو اُس کے ساتھ جاگ اُٹھے۔ یہ واقعہ دہلی میں ہوا تھا اور اب وہ قصہ گو پورے انڈیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ اب امام بخش بھی اپنی تاریخ کو لے کر جاگا۔ تاریخ نے انگڑائی لی اور جاگ اُٹھی۔ امام بخش جاگ تو گیا مگر کھاٹ سے اُٹھ نہ سکا۔ زمانہ بدل گیا تھا۔ جسم تو وہی تھا۔ ایسا کمزور ہوا کہ

کھاٹ سے اُٹھ نہ سکا۔ لوگ بولتے کہ فالج ہوا ہے۔ جسم سو چکا ہے اور اب کبھی اُٹھنے کا نہیں ہے۔ امام بخش کھاٹ پر ڈیوڑھی میں ڈال دیا جاتا اور شام کو وہ کھاٹ اُٹھا کر اوپر کتابوں والے حجرے میں رکھ دی جاتی۔ یہ اب معمول ٹھہرا اور امام بخش رات کو کتابوں سے مصاحبت کرتا اور مکالمہ کرتا اور دن کو چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھتا اور اُن سے گُنگ زبان سے باتیں کرتا۔

یہ ایک عجیب رشتہ تھا کہ بے جان کتابوں سے امام بخش مکالمہ کرتا تھا اور جاندار انسانوں سے گُنگ زبان سے باتیں کرتا تھا۔ امام بخش ایسا سوتے جاگتے کا قصہ تھا کہ داستان بھی دنگ رہ جائے۔ زمان و مکاں کا تصور ہر کہانی قصے کی بنیاد ہوتا ہے اور امام بخش کا زماں بدل چکا تھا مگر مکاں تو وہی تھا۔ اب چونکہ شہر کینچلی بدل چکا تھا۔ امام بخش جنموں کا سویا ہوا۔ اُٹھ بیٹھا اور بولا میری کھاٹ اٹھاؤ اور مجھے بدلے ہوئے شہر کو دکھاؤ۔ اس پر مشاورت ہوئی کہ کتنے جنموں کا سویا ہوا امام بخش اب شہر کو دیکھے گا تو پہچان نہیں پائے گا۔ پھر کیا ہوگا؟

''پھر کیا ہوسکتا ہے۔'' کسی نے کہا۔

''پھر یہ ہوسکتا ہے کہ یا تو امام بخش کھاٹ پر آخری سانس لے لے گا یا وہ اُٹھ بیٹھے گا اور شہر کے تیور دیکھ کر فیصلہ کرے گا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ اب ایسا ہوا کہ امام بخش کے پاس دنیا سے تاریخ کے تاجر آنا شروع ہوئے کہ کسی کو زبان کی جڑیں تلاش کرنی تھیں، کسی کو تقسیم ہندوستان کا چُورن بیچنا تھا۔ کسی کو فیض کی تلاش تھی۔ کسی کو منٹو کی تلاش تھی۔ سب اپنے اپنے ایجنڈوں پر کام کر رہے تھے۔ ایسے میں امام بخش کی کھاٹ کو ڈیوڑھی میں رکھا جاتا تھا اور اُن سے ملنے والے آتے تھے اور وہ ان کو تاریخی ٹوٹے بتاتے۔ ان کی معلومات میں اضافہ کرتے۔ شہر کے قصہ گو کہ اب نہیں رہے تھے مگر کہانی کے پارکھ ضرور آتے تھے اور باتوں میں گھیر لیتے تھے۔ امام بخش شہر کی کُوچہ گردی اور کُوچہ شناسی میں طاق تھا۔ اُسی نسبت سے بے تاب بھی تھا کہ شہر کے اوپر کیا گزری۔ اور شہر میں اب کس قسم کی کہانیاں جنم دیں

گی۔ اُس کا کھوج لگایا جائے۔ ایسے میں شہر کی تلاش میں امام بخش نکلا تو حیران رہ گیا۔ شہر چوری ہو چکا تھا۔

یہاں ایک حلوائی کی دکان تھی۔ کیا ہوئی۔ برفی اور اندرسّے اچھے بناتا تھا۔ شام کو سموسے لگاتا تھا اور ہاں اُس کے بازو میں فالودے، قلفیوں اور ربڑی ملائی کی دکان تھی۔ جن پر گاہکوں کی ریل پیل دیدنی ہوتی تھی۔ یہ چوک کے اطراف کی ساری رونق کدھر گئی۔

"چوک کو کُھلا کیا گیا ہے۔ سڑکوں کو چوڑا کیا گیا ہے۔ آبادی بڑھ رہی تھی۔ جب سڑکیں تنگ ہو جاتی ہیں تو ٹریفک گھنٹوں بلاک رہتی ہے۔ جیسے انسان کے دل کی شریانیں جب بند ہونے لگتی ہیں تو دل کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ اس شہر کو دل کا دورہ پڑا تھا تو یہ شریانیں کھولنی پڑی تھیں۔"

"یہاں حکیموں کا بازار تھا۔ کندھے سے کندھا ملا کر حکیموں کی دکانیں، مطب، مشروب کے طرح طرح کے ذائقے۔ عرقیات و مُربہ جات کے ساتھ خمیروں اور کُشتوں کے طرح طرح کے نسخے اُن کے نام سے بکتے تھے۔ وہ بازار کہاں گیا۔ بلکہ ایک دو چار حکیم تو جرّاح بھی تھے۔ اور جرّاحی کا ساز و سامان موجود ہوتا تھا۔ اب اِتنے ذہین لوگ ایک ساتھ کیسے بیٹھ سکتے تھے تو ایسا تھا کہ یہ حکیم لوگ صبح سفید کپاس کے شلوار قمیص میں جو استری کی ہوئی ہوتی تھی۔ اپنے خوبصورت خاندانی وجاہت کے چہرے کے ساتھ آتے اور آلتی پالتی مار کر اپنی نشست پر براجمان ہو جاتے۔ اُن کے کارندے موجود ہوتے تھے اور پھر کاروبار شروع ہوتا تھا۔"

"مگر اب یہ بازار تلف ہو چکا ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ حکیموں، معالجوں، جراحوں اور حلوہ جات کے ماہرین کے گاہک ختم ہو گئے۔ نہ تو وہ کُشتے رہے نہ وہ مقوی ادویات رہیں نہ وہ جنسی ٹوٹکے رہے۔"

''لیکن اتنا بڑا بازار کیسے لپیٹا جاسکتا ہے۔ کیا معاشرے کے پھوڑے پھنسیاں ختم ہو گئے کہ جراحوں کو کوُچ نکالا مل گیا۔ طبیبوں لبیبوں کا ایک مقام ہوا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ علاقے کے مسائل حل کیا کرتے تھے۔''

''کچھ تو اُن خاندانوں سے اگلی نسلوں میں حکمت کے راز جاننے والا کوئی نہ رہا۔ کچھ انہوں نے بھی سینہ بہ سینہ نسخوں کو راز بنا کے رکھا اور جس طرح چینی، مصری اور افریقی تہذیب میں مال و دولت اور خزانے قبروں ہی میں صاحبِ خزانہ کے ساتھ دفن کر دیئے جاتے تھے۔ ایسے ہی یہ حکماء، طبیب اور کُشتہ فروش اپنے سینہ بہ سینہ نسخے قبروں میں لے گئے۔ ان کی اولادیں کب تک دیسی گھی، مربے اور شربت بیچ کر گزر اوقات کرتیں۔ دکانیں بیچ کر کسی اور سمت کو نکل گئے۔ اب کہیں کہیں اُن کے سائے گلیوں کُوچوں میں اپنی دکان جمائے بیٹھے ہیں۔''

''مگر یہ محض ایک بازار نہیں تھا نہ کاروبار تھا۔ ارے یہ تو تہذیب کی نشانی تھی۔ ان حکماء میں سے کتنے تو شاعر ہوا کرتے تھے۔ مصنف اور موسیقی کے ساتھ ساتھ زرعی امور کے ماہر ہوا کرتے تھے۔''

''ہاں مگر وہ بساط لپیٹی گئی۔ اور یہ سب شہروں کا مقدر ہوا کرتا ہے کہ پرانی تہذیب کو جب نئی تہذیب گھیر لیتی ہے تو پرانی تہذیب کہیں سمٹ کے رہ جاتی ہے۔ یہاں بھی ایسا ہوا ہے۔''

''اور میں سوتا رہا۔ کوئی میرے شہر کو لُوٹ کے لے گیا۔'' امام بخش نے افسوس کیا۔

''اب کچھ طباخیوں، کبابیوں، تندوروں، باورچیوں اور خوانچہ فروشوں کی سناؤ۔ وہ کہاں اُٹھ گئے۔''

''وہ جن کے ہاتھوں میں ذائقے تھے۔ وہ ہاتھ کمزور ہو گئے۔ اپنے ذائقے اپنے

ساتھ لے گئے۔''

''وہ جو نانبائی تھے نائی تھے جو شادیوں اور غمی کے موقع پر دیگیں ٹھنٹھناتے تھے۔ جنہیں پکوئیے کہتے تھے ان کی نسل آگے بڑھی؟''

''پہلے تو شہر سے چھابڑی۔ خوانچے اور تندور کے اڈے ایک ایک کر کے غائب ہو گئے۔ کیونکہ ان کی جگہوں پر توسیع ہونے لگی۔ تاجروں نے انہیں وہاں سے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ جو نامی گرامی پکوئیے اور نائی تھے ان کا زمانہ لد گیا۔ وہ جو جاگیرداروں، زمینداروں اور نوابوں کی حویلیوں اور کوٹھیوں میں سات سات دن شادی کے موقع پر دیگیں چڑھائی جاتی تھیں وہ سب قصۂ پارینہ ہو چکے۔ نائیوں کبابیوں کا فن اُن کے ساتھ ہی رخصت ہوا۔ اب تو فوڈ مارکیٹیں، فوڈ chains اور بڑے بڑے ریستوران شہر کی بھوک مٹانے میں دن رات مصروف نظر آتے ہیں۔''

امام بخش کا ماتھا ٹھنکا کہ ہو نہ ہو یہ کوئی اور ہی جنم ہے۔ جب شہروں کے ذائقے پکوان اور پکانے والے نہ رہیں تو وہ شہر کس طرح کے لوگوں سے آباد ہو گا۔ اب جو باغوں بغوچیوں اور باؤلیوں کی خبر کو نکلے تو امام بخش کا سانس گھٹنے لگا۔ کسی نے بتایا یہاں کبھی کوئی باؤلی کوئی بغوچی ہوا کرتی تھی۔ اب تو وہاں بے ڈھنگی عمارتوں کے عفریت پھیل چکے تھے۔ پھول پھلواڑی بیلیں اور کیاریاں دیکھنے کو نہیں ملیں تو امام بخش نے کہا۔ ''چلو بھئی کوچہ نوحہ گراں اور تعزیوں کی گلی کی خبر لیتے ہیں کہ ایسے شہروں میں گریہ اور نوحہ گری کی روایت کو تو زوال نہیں آیا کرتا۔

اب جو ایک مشہور گلی کا رُخ کیا جہاں ہزاروں سال سے ایک آستانہ مخصوص برائے گریہ اور مجالس ہوا کرتا تھا کہ جس کے اطراف کا محلّہ افغانی النسل خاندان نے آباد کیا تھا۔ پھر انہوں نے یہاں کی زبان سیکھی اور پھر یہ آستانہ آباد کیا۔ جس میں ایک قبرستان بنایا جس میں اُن کے بزرگ اور جدِ امجد مدفون ہوئے اور اُس کی توقیر بڑھ گئی۔ اب اُس درگاہ

کے بازو میں ایک بیری کا پیڑ معلوم نہیں کتنے ہزار سالوں سے اپنی جڑیں پھیلائے ایک خوبصورت بڑھیا کی طرح قبروں پر سایہ پھیلا رہا تھا اور کہتے ہیں معجزہ یہ تھا کہ اس کی کسی جڑ نے کسی قبر میں قدم نہیں رکھا۔ وہ جڑیں کہاں سمٹ جاتی تھیں سینکڑوں ہزاروں قبروں میں سے کسی قبر میں نہ کبھی دراڑ اُبھری نہ قبر پھٹی۔ بیری کا پیڑ قبروں میں سونے والوں کی نیندوں میں مخل نہیں ہوا تھا۔ درخت چاہے کیکر کا ہو چاہے شیشم کا ہو۔ بیری کا ہو یا پیپل یا بڑ کا۔ اُس کی جڑیں کبھی کسی قبر میں سونے والے کو پریشان نہیں کرتیں۔ پیڑوں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں کوئی اخلاقی قدریں ہوتی ہیں۔ پیڑ انسانوں سے زیادہ انسان دوست ہوتے ہیں۔

اس درگاہ اور آستانہ کے چاروں طرف جو مکان بنائے گئے وہ لکڑی کے دروازوں، کھڑکیوں اور جھروکوں کے ساتھ ایک طرح کے طرزِ تعمیر کا نمونہ تھے اور ان گھروں میں اسی خاندان کے گھرانے آباد تھے۔ یہ صدیوں کا قصہ تھا۔ مگر اب امام بخش جب اُس گلی میں آیا تو حیران پریشان کہ گلی بالکل خالی، نہ آدم نہ آدم کا نشان یہ تو وہ گلی ہوا کرتی تھی کہ کھوے سے کھوا دن میں بھی چھلتا تھا اور شام میں بھی اور رات میں اب تو دور دور تک گلی سنسان تھی۔ گھروں کے دروازوں پر تالے پڑے تھے۔

''زنجیر پڑی دروازے پر''

ابنِ انشا کیا اس وقت کے لیے یہ کہہ گئے تھے۔ وہاں تو پورا محلّہ اور اُس کے سینکڑوں مکان خاموش پڑے تھے۔ اب امام بخش نے اپنے دماغ کو سنبھالا کہ اُس نے یہ دوسرا جنم کیوں لیا۔ یا شاید وہی ایک ہی جنم ہے اُس کی عمر کی میعاد زیادہ عطا ہوگئی ہے۔ تو اب ایسا تھا کہ امام بخش ذرا آگے بڑھا اور اُن مکانوں کی ڈیوڑھی پر رُکا۔ نام کی پلیٹ پڑھی تو معلوم ہوا یہ مکین اور اُن کی اولادیں تو کب کی یہاں سے جا چکی ہیں۔ مگر کہاں جا چکی ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ بزرگوں کا نشیمن تھا۔ صرف ایک یا دو گاڑیاں اندر آ سکتی تھیں۔ مگر اب تو

زمانہ قیامت کی چال چل گیا ہے تو اب وہاں نہ گاڑی تھی نہ مکین تھا۔امام بخش نے پوچھا مکین تالے لگا کر کہاں چلے گئے۔'' تو اسے بتایا گیا کہ یہ دوسرا جنم ہے اور مکین یہاں سے اس لیے نقل مکانی کر چکے ہیں کہ اُن کی اولادوں نے بیرونِ ملک بسیرا کیا اور کشادہ جگہوں اور کشادہ شہروں میں اپنے لیے کوٹھیاں بنائیں کہ وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ اپنے خاندان کو یہاں سے لے جائیں کہ ان کو گھٹن کا احساس کم ہو۔''

''تو ان قطار اندر قطار گھروں میں اب کوئی نہیں آئے گا۔''

''نہیں جب محرم الحرام کا چاند دکھائی دیتا ہے تو ہر گھر کی زنجیر کھول دی جاتی ہے۔اور خاندان کے بزرگ جوان عورتیں مرد آ کر بسرام کرتے ہیں۔محرم کی چھل پہل پھر سے گلی میں اُمڈ آتی ہے۔پھر سے کھوّے سے کھوّا چھلتا ہے، گریہ و ماتم کی آوازیں گونج اٹھتی ہیں۔ہر طرف سیاہ لباسوں اور ماتمی ٹولیوں کے جھنڈ کے جھنڈ حدِ نظر تک گلی میں نظر آنے لگتے ہیں۔''

''ان گھروں کے چراغ اور چولہے پھر سے جل اُٹھتے ہیں۔''

''ہاں مگر ایک فرق ہوتا ہے کہ پہلے نیاز اور تبرک گھروں میں بنتا تھا۔اب باہر سے پکا پکایا آتا ہے اور تقسیم ہو جاتا ہے۔''

''محرم کے دس دن آستانے کی رونق شب بھر جاری رہتی ہے۔''

''صرف دس دن نہیں کبھی کبھی چہلم تک برابر مجالس جاری رہتی ہیں اور نیاز و تبرک بھی جاری رہتا ہے۔مجالس صبح، دوپہر، شام، رات اور فجر تک جاری رہتی ہیں اور اعزادار برابر حاضر رہتے ہیں۔ان کی خاطر نیاز جاری رہتی ہے۔''

امام بخش اس ثقافت اور تہذیب کا شناور تھا۔اس سے کچھ چھپا ہوا نہیں تھا مگر آج جو خالی گلی کا منظر دیکھا تو چونک گیا اور پلک جھپکتے ہی اُسے لگا وہ اُسی محرم کی گلیوں میں پہنچ گیا ہے۔ہر گھر میں عورتوں اور مردوں کی سواریاں آ جا رہی ہیں۔علم بردار گزر رہے ہیں۔ماتم

دار حسبِ توفیق ماتم و گریہ میں مصروف ہیں، دس محرم کے قریب تو ننگے بدن پر زنجیر زنی کے مناظر اور خون آلود پنڈے دائرے میں گھومتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں اور منبر پر سوز خوانوں کی ٹولیاں بین اور نوحے کے لحن کا باکمال مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ذاکر حضرات اور علماء اپنے اپنے فن میں طاق، خطابت اور بیان کے تمام مراحل کے راز دان، انسانی نفسیات کے اتار چڑھاؤ کے پارکھ منبر پر براجمان سب کی نبض پر ہاتھ رکھے رواں ہیں۔ کوئی میر باقر علی ثانی ہے تو کوئی میر انیس کے گھر کا چشم و چراغ ہے تو کوئی میرزا دبیر کا خوشہ چیں ہے۔ سب کا کوئی نہ کوئی حوالہ ہے۔ ورثہ ہے اور روایت ہے۔ امام بخش اُسی ہمہ ہمی اور گہما گہمی میں گھوم رہا ہے۔ چشم تصور چشمِ حقیقت میں ڈھل چکی ہے اور وہ کسی سے کلام کرتا ہے۔

''کیا پُرسہ نہیں دو گے۔''

''ہاں تو کس کس کا پُرسہ دوں۔ پورا خانوادۂ رسول ﷺ تو قربان ہو گیا۔ میاں بچے حُرمل کے تیر سے شہید ہو گئے۔ اب پُرسے کو آئے ہو۔ کربلا جیسی کربلا ہو گئی۔ میاں اب پُرسے کو آئے ہو۔''

''ہاں میاں پُرسے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ کیا تم نے مشہد میں امام علی رضا علیہ کے روضہ مبارک پر دن رات صبح شام ہجوم دیکھا ہے تو جا کر دیکھو پُرسے کا کوئی وقت نہیں دن رات پُرسہ جاری ہے اور کیا تم نے کربلا میں نہیں دیکھا۔ نجف اشرف، کاظمین شریفین اور قم کے شہر سے لے کر شام کے بازاروں میں نہیں دیکھا پُرسہ جاری ہے۔ کیا تم نے بارہ اماموں کے روضے نہیں دیکھے پُرسہ جاری ہے۔ پوری تاریخ ہمارے لیے پُرسہ ہے۔ پوری تاریخ قربانیوں اور شہیدوں کے اذکار سے خونم خون ہے۔ کیا زمانے تھے میاں کہ ہم نہ تھے۔ ورنہ ہمارا خون بھی تاریخ میں درج ہو جاتا۔''

''ہاں تو پھر کیا معلوم میں بھی شہید ہو چکا ہوں اور تم بھی شہید ہو تو کیا شہید اب شہید سے پُرسہ کرے گا؟''

''ہاں میاں یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ یہاں جو ہم سب پھر رہے ہیں تو کون کربلا سے آیا ہے، کون مشہد سے، کون شام سے، کون عرب سے اور کس کس میں شہید کی روح ہے۔ یہ جو ہم چل پھر رہے ہیں تو ہوسکتا ہے یہ قیامت ہی کی گھڑی ہو کہ ہم سب شہداء کا امتحان ہوں۔''

''ارے یہ تو میں نے اب سمجھا کہ یہ سب زمانوں کا فتور ہے۔ سبھی زمانے آپس میں گڈمڈ ہوگئے ہیں۔ ہوسکتا ہے میں عباس علمدار کے زمانے کا ہوں کہ زین العابدین کے زمانے کا کہ میں مولا علیؑ کا سوگوار ہوں۔ میں کون ہوں۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔''

''تو میاں سوچو بھی مت یہاں کون شہید ہے کون سوگوار یہ تو تم جان ہی نہ پاؤ گے۔''

''ہاں یہ تو اب مشکل میں پڑ گئے۔ سب زمانوں کی چال ہے۔ زمانے ہمارے شعور لاشعور سے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ میاں یوں سمجھو ہم سب زمانوں میں تھے اور سب زمانوں میں رہیں گے۔ قصہ ختم کرتے ہیں۔''

''ارے قصے کبھی ختم ہوتے ہیں۔ کیا آج تک کوئی قصہ ختم ہوا ہے۔ یہ تمہاری بھول ہے۔ قصہ تو قصے سے ملتا ہے جیسے پانی پانی سے ملتا ہے، تو قصہ جاری رہتا ہے۔ ہم بھی جاری ہیں قصے کی طرح۔ شہید کا خون دوسرے شہید سے جا کر ملتا ہے۔ اور خون کی لکیر چلتی رہتی ہے۔''

''یہ تو تم نے خوب کہی۔ اس طرح تو میں اور آپ ازل سے موجود ہیں۔ ازل سے شہید ہو رہے ہیں۔''

''ایسا ہی سمجھو میاں۔ شہید کے متعلق تو مشہور ہے کہ شہید کبھی مرتا نہیں تو سمجھ لو ہم نہیں مرے نہ مریں گے۔ جب نہیں مریں گے تو ہر زمانے میں ایسے ہی رہیں گے جیسے اب ہیں اور باتیں کر رہے ہیں۔''

''واہ صاحب آپ نے تو معاملہ ہی سلجھا دیا اب کوئی شہید جو زندہ ہے وہ دوسرے زندہ شہید کا پُرسہ کیوں دے۔''

''اب ہم ایسی جگہ پر ہیں کہ جہاں کوئی زمانہ نہیں۔ اس سے اچھی جگہ تو ہو ہی نہیں سکتی کہ آپ زمانوں سے آزاد ہو جائیں۔ چاہیں تو پیچھے چلے جائیں۔ حضرت عیسیٰ کے زمانے میں، چاہیں تو حضرت موسیٰ سے ہاتھ ملائیں، چاہیں تو عرب کے صحرا کی ریت کے ذرے بن کر فخرِ کائنات اور رحمتہ اللعالمین کے پاؤں کی خاک بن جائیں۔ کتنی بڑی سعادت ایک لمحے میں حاصل ہوگئی۔''

''یہ زمانوں کا ہیر پھیر ہمیں کہاں لے آیا۔''

''ہاں میاں، ہم تو خوش نصیب ٹھہرے کہ زمانوں کی آویزش نے ہمیں تو کم سے کم سرخرو کیا کہ ہم چاہیں تو کسی کے حضور پیش ہو جائیں اور کسی کے لیے شہید ہو جائیں۔''

''مگر حضرت یہ بھی نصیبوں پر منحصر ہے۔ کس کو کس زمانے میں کیا رتبہ ملتا ہے۔ یہ ہم آپ تو طے نہیں کر سکتے۔''

''ہاں میاں یہ تو ہے۔''

''بس یہ تو ہے۔''

''تو پھر میں خود کو شہید سمجھوں کہ غازی۔''

''نہ ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں نہ ہمارے پاس کوئی اختیار ہے۔ یہ تو ہم سوچ رہے ہیں کہ ہم زمانوں کے حصار کو توڑ آئے ہیں۔ ہوسکتا ہے زمانوں نے ہمارے گرد حصار بنا دیا ہو۔''

''تو اب آپ نے تو ایک نیا بکھیڑا کھڑا کر دیا کہ ہم زمانوں کے قیدی ہیں یا زمانے ہمارے قیدی۔''

''یہ تو اہم سوال ہے بھائی۔ معلوم کرو۔''

"یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے ہم دونوں نہیں سمجھ سکتے؟"

"کیوں نہیں سمجھ سکتے۔"

"اس لیے کہ جب زمانے گڈمڈ ہو جائیں تو فیصلہ نہیں ہو سکتا۔"

"یہ تو البتہ بات اہم ہے۔"

"تو میاں خود پر قیاس کرو اور سمجھو کہ تم جو ہو وہی تم ہو۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ مگر سوال اٹھتا ہے کہ میں کون ہو؟"

"ارے میاں کچھ تو تم ہو گے؟"

"ہاں میں اب جو بھی ہوں اپنی مرضی سے ہوں تو سمجھ لو میں شہید ہو چکا ہوں۔"

اب امام بخش اپنے خواب اور تصور سے باہر آ چکا تھا۔ گلی خالی تھی۔ سنسان اور بے آواز وہ گھومتا رہا نہ وہاں محرم الحرام تھا نہ کوئی مکین۔ وہ وہاں سے گزر گیا اور اب وہ ان گلیوں میں آیا جہاں بزاز، پنساری، منیاری والے، حلوائی، طباخی گوٹہ کناری اور سُنارے اپنی اپنی دکانیں سجائے رہتے تھے۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ امام بخش نے پوچھا۔ "ادھر تو سب کی دکانیں تھیں۔ ایک معاشرت تھی۔ ایک زمانہ تھا اب کیا ہوا؟"

"تو وہ اب اپنا کاروبار گلیوں سے بازاروں میں اور بازاروں سے شاپنگ کمپلیکس میں لے جا چکے ہیں۔"

"تو اب ہم دکانیں نہیں دیکھ سکیں گے۔"

"ہاں اب دکان نہیں ملے گی شاپنگ سنٹر ملیں گے۔"

اب امام بخش وہاں سے سٹک گیا۔ مگر اُسے جانا کہاں تھا۔ وہ بے چین روح وہاں سے نکلا تو ایک چوراہے پر کھڑا ہو گیا "یہاں تو لائبریری تھی۔ ساتھ میں باغیچہ تھا اور لائبریری کا نام بھی باغ کے نام پر تھا۔ مگر اب کیا ہوا؟ یہاں تو بس آثار ہیں نہ لائبریری نہ باغ۔"

"ہاں ایسا ہی ہوا ہے۔ شہر جب نہیں رہے گا تو لائبریریاں کیسے رہ سکتی ہیں۔"

امام بخش شہر کے پرانے قلعے کے کبوتروں میں آن بیٹھا۔ کبوتروں نے چونک کر اڑان بھری پھر آن اُترے۔ اُسے محسوس ہوا یہ جنم جنم کے فقیر کبوتر اُسی طرح جنموں سے یہاں بیٹھے ہیں اور شہر میں سب پہچان کے لوگ اُٹھ گئے تو کیا ہوا؟ یہ کبوتر اُسے پہچانتے ہیں۔ کبھی کبھی لاڈ میں آ کر مرنے کی اداکاری کرتے ہیں اور جب انہیں اُٹھانے جاؤ تو پھر سے اُڑ جاتے ہیں۔ گویا کامیاب اداکاری کی داد وصول کرتے ہیں۔ یہ اداکار کبوتر امام بخش کو بہت پیچھے لے گئے۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے ایسے زمانے میں پہنچ گیا کہ جب بہروپیئے باقاعدہ ایک فنکار کی صورت موجود ہوتے تھے۔ کہیں نہ کہیں سے یا لنڈے بازار سے طرح طرح کے کپڑے جمع کر کے رکھتے تھے اور پھر بہروپ بدل کر نکلتے تھے اور اچھے اچھوں کو اپنے میک اپ اور گٹ اپ سے چکر دینے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ امام بخش نے اس پر غلام عباس کا افسانہ ''بہروپیا'' بعد میں پڑھا تھا لیکن ان فنکاروں کو وہ پہلے سے جانتا تھا۔ یہ بے حد غریب فن کار تھے۔ اگر اُس زمانے میں کبھی ٹی وی یا ریڈیو ان کے پاس ہوتا تو وہ آسانی سے بڑے فنکار بن کر اُبھر سکتے تھے۔ مگر وہ تو گلیوں سے نکل کر نوابوں، جاگیرداروں اور کارخانہ داروں تک ہی پہنچ سکے اور کچھ معمولی سا انعام لے کر رہ گئے۔ یہ بہروپیئے روزانہ بہروپ بدل کر نکلتے اور اپنی آزمائش بازاروں، گلیوں اور سڑکوں پر کرتے ہوئے کسی نہ کسی بڑے امیر آدمی کے روبرو پہنچ کر فن کی داد لیتے اور جب وہ نہ پہچان پاتے تو اپنا اصل روپ دکھا کر انعام کے حق دار ٹھہرتے۔ کبھی کبھی تو انعام میں نقدی مل جاتی۔ نہیں تو آٹا، سبزی، اناج، یا اور کچھ نہیں تو روٹی مل جاتی۔ جو وہ لے لیتے۔ اب امام بخش نے کبوتروں کا فن دیکھا تو داد دینے کو دانے کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔ سو دانہ ڈالا اور پُرانے قلعے کے دمدمہ پر آ گیا۔ یہ بہت اونچی جگہ تھی جہاں سے شہر کو بیرونی حملہ آوروں سے بچانے کے لیے توپچی اور سپاہی دور تک نگاہ رکھ سکتے تھے۔ اُس کے نیچے شہر پناہ تھی جہاں سپاہی براجمان رہتے تھے۔ شہر بھی کیا تھا۔ صرف فتح ہونے کے لیے بنایا گیا تھا۔ جو آیا چڑھ دوڑا اور پھر قابض ہو کر یہیں کا

ہو رہا اور فاتحین مفتوحین سے گھل مل کر رہنے لگے۔ آپس میں شادیاں اور خوشی غمی میں مصروف رہنے لگے۔ اب جو امام بخش نے دمدمہ سے نگاہ کی تو سر پیٹ کر رہ گیا۔ شہر کا شہر کئی طرح کے گردابوں میں پھنسا ہوا تھا۔ ایک طرف نگاہ کی تو شہر کے مکان خاک آلودہ دیوار سے دیوار لگے خاموش اور حیران کھڑے تھے اُن کے آگے رنگین سائن بورڈوں کا ایک ختم نہ ہونے والا حاشیہ لگا ہوا تھا۔ ایسے لگا کہ شہر کو ان سائن بورڈوں نے جکڑ رکھا ہے اور ان کی سانس گھٹ رہی ہے۔

اب امام بخش نے دوسری جانب نگاہ دوڑائی تو شہر کو جیسے فلائی اوورز کے آکٹوپس نے جکڑ رکھا تھا۔ وہ حیران کہ میرا شہر ایسا تو تھا نہیں کہ اس پر ان فلائی اوورز کا بوجھ ڈالا جائے۔ وہ بھی آکٹوپس جیسا۔ آخر اس شہر کو ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ اب امام بخش کو فکر ہوئی کہ وہ جو شہر میں پہلی شیورلیٹ آئی تھی۔ پھر اُس کی چھت کے بغیر گاڑی آئی تھی۔ جسے دیکھنے کے لیے شہر سڑک کنارے انتظار کرتا تھا کہ کب ضرغام خان کوٹھی سے نکلے گا اور چھت کے بغیر شیورلیٹ کو سڑک پر لائے گا اور پہلی بار جب وہ کیسٹ اپنی گاڑی میں لگائے گا تو اُس پر پورا شہر کس طرح اُمڈ آئے گا۔ اب وہ کیسٹ کیا تھی۔ کوئی گلوکار مہدی حسن تھا۔ جس کو اُس وقت کوئی نہیں جانتا تھا۔ مگر اُس نے دو تین غزلیں ایسی گائیں کہ دنیا دیوانی ہوگئی۔ امام بخش کو اس کی اطلاع ضرغام خان کی شیورلیٹ میں بجنے والی کیسٹ سے ہوئی۔ اب یہ غزلیں کیا تھیں۔

؎ گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے

؎ نہ گنواؤ ناوک نیم کش تنِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو............

اب امام بخش نے آکٹوپس میں جکڑے شہر کو دیکھا تو اپنے دوسرے جنم پر فاتحہ پڑھی کہ میں کیوں آ گیا یہاں۔ مگر ہر ایک کے لیے دوسرا جنم آزمائش ہوتا ہے۔ اور وہ اُس

کی سزا ہوتی ہے۔ سوامام بخش کا یہ جنم اُس کے لیے سزا سمجھی گئی۔ اب جب یہ سزا ہی ٹھہری تو پھر امام بخش نوابوں، جاگیرداروں، زمینداروں اور فاتحین کی حویلیوں اور کوٹھیوں کو دیکھنے نکل پڑا۔

اب کیا ہوا؟

یہاں نہ تو حویلیاں نہ کوٹھیاں نہ بنگلے نہ ڈیوڑھیاں نہ زنان خانے نہ مردان خانے نہ غلام گردشیں نہ دیوان خانے نہ فصلیں نہ جھروکے۔ سب کی بساط کس نے لپیٹی۔

''بس یہ سب اچانک نہیں ہوا۔ جب ملک کا حدود اربعہ بڑے ملک سے الگ ہوا تو۔ شہر سے سب ہندو اور سکھ کہ سب رعایا میں سے تھے۔ صدیوں کے حملوں کا بوجھ سہتے آئے تھے اور ہمیشہ کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتے ہوئے زندگی گزار رہے تھے۔ سکھ تو ذرا کم تھے کہ پنجاب پر سکھ راج کے وقت انتظامی امور کے لیے آئے اور پھر اِدھر اُدھر ہو گئے۔ یہ ہندو چھوٹے چھوٹے پیشوں سے وابستہ تھے۔'' امام بخش یہ سب جانتا تھا اس لیے وہ ان ہندو گھرانوں کی ہجرت کا ماجرا بھی جانتا تھا جو یہاں تپلی تپلی گلیوں میں اپنے معمولی ہُنر اور خاندانی پیشوں سے جُڑے ہوئے خاموشی کے ساتھ رہ رہے تھے۔ پیشے بھی کیا تھے۔ منڈیوں میں مزدوری، ماشکی جو شہر کی گلیاں صاف کرتے تھے۔ جو ذرا حساب کتاب جانتے تھے۔ محرر اور منشی کے ساتھ سکولوں میں بچے پڑھانے پر مامور تھے۔ جو کچھ نہیں جانتے تھے وہ شہر بھر میں خوانچے لگاتے تھے۔ جس میں دالیں، چنے، پھٹورے، پوریاں، سموسے، ٹکیاں، کباب، گول گپّے اور میٹھے میں ٹانگری، میسو، گجک اور گُڑ کی مٹھائیاں ہوتی تھیں۔ سارا دن یہ خوانچے اٹھائے گلی گلی آوازیں دیتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ یہ ہندو چپ چاپ شہروں، قصبوں اور بستیوں سے نکل گئے۔ معمولی بلوے ہوئے۔ مسلمان ان کے گھروں اور دکانوں سے دال چاول کی لوٹ مار تک ہی محدود رہے۔

اب جو کچھ ہونے والا تھا۔ اُس کی چیتاونی کسی کو نہیں تھی۔ ان غریب ہندو

گھرانوں کی جگہ جو مسلمان اس شہر میں آباد کیے گئے۔ ان کا تعلق کرنال، حصار، رہتک، گڑگاؤں، پانی پت، ہریانہ اور اُن کے اطراف کے قصبوں سے تھا اور یہ سب ان ہندوؤں کی طرح کے غریب لوگ تھے۔ مگر ایک خواب لے کر آئے تھے کہ نئی جگہ پر قسمت آزمائیں گے۔ کھونے کے لیے ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ بس یہ ان کی خوش قسمتی تھی۔ آگے کا سفر آسان تھا۔ جو پڑھ لکھ سکتے تھے وہ گھاٹے میں رہے۔ جو بس جمع تفریق جانتے تھے اُن کے لیے میدان صاف تھا۔ جو پڑھ لکھ کر آئے تھے وہ پرائمری اور ہائی سکولوں میں استاد بن گئے یا ریلوے کے ساتھ دیگر سرکاری محکموں میں اٹک گئے۔ کچھ ابتدائی زمانے کی صحافت کا حصہ بن گئے۔ محنتی لوگ تھے۔ شہر کی تجارت اور کاروباری زندگی اُن کے انتظار میں تھی۔ انہوں نے بچوں کو سکول بھیجنے کی بجائے نوزائیدہ بچوں کو بھی دکان کی چوکی پر بٹھا دیا۔ جو کاروبار انہوں نے سنبھالے ان میں کریانہ، پنسار، مٹھائیاں، مصالحہ جات، جوتا سازی، کپڑے اور سوت کی تجارت، بڑے گوشت کی دکانیں، نہاری اور حلیم کے ساتھ کباب اور دیگر پکوانوں کی چھوٹی بڑی دکانیں اور خوانچے گلی کوچوں اور بازاروں میں عام ہوئے۔

امام بخش کو یاد آیا کہ جب یہ ملک بننے کے بعد اپنے آبائی شہر اور قصبے چھوڑ کر اس شہر میں آئے تو انہیں مقامی آبادی نے ''پناہ گیر'' کا نام دیا اور خوش تھے کہ ہم نے انہیں اپنی پناہ مہیا کی ہے اور نہیں جانتے تھے کہ ایک دن وہ مقامی آبادی ان پناہ گیروں کی پناہ میں آجائے گی۔ اس بات کو کُل ملا کے پچاس ساٹھ سال ہی لگے اور معاملہ یہ ہو گیا کہ جو شہر کی املاک کے مالک تھے آج وہ کرایہ دار ہو گئے اور جو پناہ لینے آئے تھے وہ ان املاک کے مالک ٹھہرے۔ امام بخش کو انتظار حسین کا ایک افسانہ ''صبح کے خوش نصیب'' یاد آ گیا۔ اُس میں یہی صورتِ حال تھی کہ پاکستان بننے کے بعد ایک ٹرین چلی اس میں بہت دھکم پیل میں لوگ سوار ہوئے۔ اتنی بھیڑ تھی کہ آدھے سوار ہو سکے۔ آدھے یا اُس سے زیادہ ٹرین پر چڑھنے سے رہ گئے۔ اب جو سوار ہو گئے وہ خود کو خوش نصیب تصور کر کے روانہ ہو گئے۔

اُنہیں انتظار حسین نے صبح کے خوش نصیب قرار دیا۔ لیکن پھر کیا ہوا؟ وہ ٹرین راستے میں رُک گئی اور کئی طرح کی چہ میگوئیاں ہوئیں کہ آگے کس طرح کی رکاوٹ ہے۔ انجن کیوں خراب ہوا ہے؟ ریل کی پٹڑی کو کسی نے آگے سے اکھاڑ دیا ہے۔ یا آگے کسی نے رکاوٹ کھڑی کردی ہے۔ وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ شام ہوگئی تو انتظار حسین کا ایک کردار یہ بولتا ہے کہ جب ہم صبح کو چلے تھے تو خود کو خوش قسمت سمجھ رہے تھے کہ ٹرین پر سوار ہوگئے ہیں اور جو رہ گئے تھے وہ بدقسمت ٹھہرے تھے کہ رہ گئے ہیں مگر اب شام کے آتے ہی معلوم ہوا کہ وہ جو سٹیشن پر رہ گئے وہ خوش قسمت ٹھہرے اور جو ٹرین پر سوار ہوگئے وہ بدقسمت ٹھہرے۔ اب یہی بات اُس شہر پر پوری اُتری کہ جو پاکستان بننے کے بعد پناہ گیر سمجھے گئے آج وہ شہر کے مالک ٹھہرے اور مقامی آبادی اُن کی پناہ میں آگئی مگر اس پر امام بخش نے ابھی بات کرنی تھی۔ کہ یہ سب کیسے ہوگیا کہ جو پاکستان بننے کے بعد پناہ گیر ٹھہرے آج وہ مالک کیسے بن گئے۔

اب ایک تاریخ کے کیڑے نے اپنے ناخن میں سے تاریخ نکالی اور پھر کئی دہائیوں کو دیکھ کر بتا دیا کہ ہوا یہ کہ مقامی آبادی کاشت کاروں، زمینداروں، جاگیرداروں اور نوابوں کی امارت پر مشتمل تھی۔ اور ان کے ہاتھ میں ریزگاری نہیں ہوتی تھی۔ وہ جنس میں لین دین کرتے تھے۔ مگر جب زمانے کا سکہ بدلا تو شہر کا کاروبار کرنسی میں ہونے لگا۔ اب تاجروں کی بن آئی۔ کریانہ فروش، پنساری، دکان دار، خوانچہ فروش، چھینٹ، ململ، پاپلین، لٹھا، کیمرک، لیلن اور کھدر جیسے کپڑوں کی تجارت بھی نکل پڑی اور شہر کا شہر یکدم ایک نئے مزاج میں ڈھل گیا۔ زمینداروں اور کاشتکاروں کے پاس رقبے تھے۔ کوٹھیاں تھیں۔ حویلیاں تھیں مگر نقدی نہیں تھی تو نقدی والوں نے سکہ رائج الوقت کو استعمال کیا اور بقول امام بخش سب کچھ کھڑے کھڑے خرید لیا گیا۔ وہ جنہوں نے پورے کا پورا کُنبہ گلیوں، کوچوں، محلوں، بازاروں، بازارچوں اور منڈیوں میں مختلف دھندے اور کاروبار میں بٹھا دیا تھا پھر

اُن کی دن رات کی محنت رنگ لائی اور انہوں نے دن دوگنی رات چوگنی ترقی ایسے کی کہ جو پہلے خوانچہ فروش تھا پھر دکاندار ہو گیا۔ پھر دکاندار سے شوروم میں آ گیا۔ شوروم سے پلازہ کا مالک بن گیا۔ جو ٹھیلا لگاتا تھا اُس نے اپنا پکا ٹھکانہ تلاش کیا۔ ایسے میں نئی مارکیٹوں نئے بازاروں نے جنم لیا اور ٹھیلے والوں نے بازاروں کو آباد کر دیا۔ پھر جن کی ایک دکان تھی وہ دو میں بدلی۔ پھر تین میں پھر چار میں اور پھر پوری مارکیٹ اپنے نام کر لی گئی۔ جو ذرا زیادہ منافع بخش کاروبار میں تھے۔ بدلے زمانوں کی ایسی لپیٹ میں آئے کہ دکان دار سے سوداگر بن گئے اور سوداگر سے بزنس ٹائیکون اور پھر شہر کے مالک۔ مگر مالک کیسے بنے یہ جادوگری تو سمجھنے والی بات تھی جو امام بخش کو اب سمجھ میں آ رہی تھی کہ جن نوابوں، جاگیرداروں اور زمینداروں کو انگریز نے جاگیریں بخشی تھیں، ایک دن ان سے یہ ساری زمینیں اور جاگیریں لینڈ مافیا نام کا طبقہ ہتھیا لے گا اور وہ منہ تکتے رہ جائیں گے۔ کم سے کم اُس شہر میں تو یہی ہوا۔ مگر یہ لینڈ مافیا کوئی ایک دن میں پیدا ہوا۔ امام بخش کی عقل نے پھریری لی اور بات سامنے آئی کہ جمہوریت نے پاکستان میں جن طبقوں کو اپنی سرپرستی میں لیا وہ اب نہ تو سہروردی تھے۔ نہ گورمانی تھے۔ نہ بھٹو تھے۔ نہ خان تھے۔ نہ سیّد تھے نہ قریشی کرمانی تھے نہ مزاری۔ مگسی یا قزلباش قسم کے ذاتوں والے تھے۔ جمہوریت نے نوزائیدہ ذاتیں تشکیل دے دیں۔ جنہوں نے آسانی سے چوہدری، رانا، ملک اور پٹھانوں کی کئی قسم کی نسلوں کے ساتھ بے شمار شاخوں میں اپنا حسب نسب بنا لیا۔ جن کا کوئی حسب نسب نہیں بھی تھا تو انہوں نے کسی نہ کسی شاخ کا سہارا لے کر اپنے نام کے ساتھ کچھ نہ کچھ جوڑ لیا کہ جمہوریت میں برادری اور حسب نسب نے اہمیت اختیار کر لی تھی۔ امام بخش چلایا کہ یہ کیسی جمہوریت جس کی وجہ سے صرف تاجروں اور مافیا کے نمائندوں کو سیاست کرنے کا لائسنس مل گیا ہے۔ مگر امام بخش تو اپنی آخری سانسوں پر تھا۔ وہ بھلا کیا تجزیہ کرتا۔ بس تکتا رہ گیا۔

امام بخش نے اپنے شہر کا نیا ناک نقشہ دیکھا تو اداس ہو گیا۔ نہ حویلیاں رہیں، نہ

کوٹھیاں نہ بنگلے نہ اُن کے مکین۔ سب کہاں روانہ ہو گئے۔ اُن کے مردان خانے، اُن کی ڈیوڑھیاں، اُن کے دیوان خان، اُن کے مہمان خانے کیا ہوئے۔ اب اُن کی جگہ شاپنگ مال، پلازے اور کمرشل زون آ چکے تھے۔ اس پر احمد نواز انقلابی نے امام بخش کے اس دوسرے جنم میں اُس کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"امام بخش اس میں اداس ہونے کی کیا بات ہے؟"

"کیوں نہیں ہے؟ آخر اس شہر کا مزاج تھا وہ کہاں گیا؟"

"ہاں ایک ثقافتی اُداسی آپ کو ملے گی۔ مگر آپ تاریخ میں جھانکیں گے تو آپ کو ایک عجیب طرح کی طمانیت ملے گی۔"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ انگریزوں نے دو طبقے بنائے تھے۔ ایک کو اشرافیہ کہتے تھے۔ دوسرے کو رعایا؟"

"ہاں مگر اس بات سے اُس بات کا کیا تعلق ہے؟"

"ہے ناں تعلق..... سنو..... جب انگریزوں نے یہاں راج کرنا تھا تو اُس نے افغان قبیلوں اور پٹھانوں کو اپنے ساتھ ملایا اور انہیں جاگیریں اور زمینیں بخش دیں اور اُس کا پیمانہ یہ تھا کہ جہاں تک گھوڑا دوڑا سکتے ہو دوڑا لو۔ وہ علاقہ آپ کا ہوگا۔ پھر کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟"

گھوڑے تھک گئے مگر نہ انگریزوں کے خُصیہ بردار تھکے نہ اُن کے چاکر۔"

تو اس کا مطلب کیا نکلا؟"

"اس کا مطلب یہ نکلا کہ آپ جن حویلیوں، بنگلوں اور کوٹھیوں کا ماتم کر رہے ہیں وہ بے وجہ ہے کہ گورے نے ان کو اس لیے اتنے رقبے اور اتنی زمینیں دیں کہ وہ گوروں کو اُس کے بدلے رعایا پر راج کرنے کا موقع فراہم کر رہے تھے۔"

''ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔''

تو پھر آپ کس بات کا ماتم کر رہے ہیں۔ جو کل کے حاکم تھے وہ آج کے محکوم ٹھہرے اور جو کل کے پناہ گیر اور رعایا میں شمار ہوتے تھے وہ آج کے حاکم ہیں۔''

''تو کیا یہ تمہاری جدلیات کا فلسفہ ہے۔''

''نہیں میرا کمیونزم تو پٹ گیا۔ مگر گورے کو بھی آج سبق ملا ہے کہ اُس کے پالتو خاندانوں کو ہندوستان کی تقسیم نے بہت زک پہنچایا ہے۔ وہ تو ہندوستان تقسیم کر کے خوشی خوشی گیا تھا یا دوسری جنگ عظیم میں زخموں کو سہلاتا ہوا گیا تھا۔ مگر اُسے نہیں پتہ تھا کہ ستّر سالوں بعد سب کچھ اُلٹ ہو جائے گا۔''

اب ایک حقیقت اور سنو'' یہ سردار لاشاری تھا جو ملک میں سینکڑوں ٹی وی چینلز کے آنے کے بعد پوری دنیا کے چینلز کو اپنے ٹی وی پر دیکھ سکتا تھا۔ اُس نے امام بخش کو نئی کہانی سنائی۔ امام بخش تو پہلے ہی کھٹیا پہ آ چکا تھا۔ اور یہ اُس کا نیا جنم تھا۔ ویسے پرانا جنم بھی نیا ہی ہوتا ہے۔ بات تو محسوس کرنے کی ہے۔ امام بخش اب زمانے کے سرد و گرم سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ زمانے گود میں لیے بس سب کو دیکھتا رہتا تھا۔ جب آپ زمانوں کو گود لے لیتے ہیں تو زمانے آپ کی اولاد بن جاتے ہیں۔ امام بخش اولاد سے لپٹا ہوا تھا۔ مگر جب کہانی کے لیے سردار لاشاری نے چونچ کھولی تو وہ سر نیہوڑا کر متوجہ ہوا۔

''دیکھو بابا امام بخش۔ ویسے تو ہم بھی اب بابوں سے کم نہیں ہیں۔ لیکن اب سن لو کہ انگریزوں کو دنیا میں ہر جگہ اپنے گماشتوں اور خُصیہ برداروں کو ایسے دن دیکھنے پڑ رہے ہیں کہ جدید دنیا نے عروج و زوال کی کہانیوں کو یقین کے ساتھ قبول کرنا شروع کر دیا ہے۔''

''ہاں تو یار بولو..... میں تو سننے کو تیار ہوں۔ نہ میں انگریزوں کا گماشتہ نہ میں اس تاریخ کا قرض دار ہوں۔'' امام بخش بولا۔

''ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ امام بخش اب ہم سب تاریخ کا حساب چکانے کے لیے

تیار ہیں۔'' سردار لاشاری بولا۔

''کیا قرض چکاؤ گے۔ پتہ بھی ہے تاریخ کا بوجھ کیا ہوتا ہے؟ کئی ہزار صدیوں کا بوجھ تم محکوم لوگ کیا اٹھا سکتے ہو؟'' امام بخش گویا ہوا۔

''اُدھر ہندوستان میں محکوم ریاستوں نے یہ بوجھ اٹھا لیا ہے۔ امام بخش بھانت بھانت کے ٹی وی چینل آ گئے ہیں جو مال بیچنے کے لیے تاریخ بھی بیچنے لگے ہیں۔'' سردار لاشاری بولا۔

''وہ کیسے؟ تاریخ بھی بکتی ہے؟ مگر کس بھاؤ؟''

''ہندوستان میں تو تاریخ ڈالروں کے بھاؤ بک رہی ہے۔ بے شمار بیوپاری فلائٹیں پکڑ کر آتے ہیں اور تاریخ کے شیدائی ہو کر ٹوٹے پڑتے ہیں۔ ہندوستان کی سب سے بڑی آمدنی اسی تاریخ سے ہو رہی ہے۔''

''تاریخ بیچنے کا ڈھنگ مہاجن اور بنیئے کو خوب آتا ہے۔ مگر کیسے بیچتا ہے تاریخ کی پڑیا بنا کر یا معجون بنا کر؟''

''امام بخش نہ پوچھو۔ تاریخ کئی طرح سے بیچتا ہے یہ بنیا یا مہاجن۔'' سردار لاشاری نے کہا۔

''ہماری تاریخ کا کوئی خریدار نہیں ہے؟ یا ہمیں بنیاء بننا نہیں آتا۔'' امام بخش بولا۔

''ہم نے اپنی تاریخ کے ساتھ غفلت برتی ہے۔ ہمارے ہاں قبضہ مافیا نے تاریخ کو اینٹوں اور کتبوں سمیت کھایا ہے۔ اُس کی ہڈیاں بھی نہیں چھوڑیں۔ ہم سے تو وہ بنیاء اچھا نکلا کہ تاریخ کی حفاظت تو کی۔ اب اُس کی اولادیں اُسے کیسے بیچتی ہیں یہ تو اب تاریخ جانے اور وہ۔'' سردار لاشاری ''دیکھو میاں تاریخ کو خوب چمکائے رکھو۔ اُس کے ساتھ کہانیاں جوڑو۔ ان کہانیوں کو ذرا مانجھا لگاؤ مرچ مصالحہ لگاؤ۔ تمہیں پتہ ہے ہندوستان میں

مرچ مصالحہ بہت ہوتا ہے۔ پھر ان کہانیوں سے کچھ داستانوں کا ملاپ ایسے کرو کہ لگے داستان تاریخ میں سے نکلی ہے یا تاریخ داستان میں سے نکلی ہے۔ یہ پتہ نہ چلے۔'' امام بخش نے فارمولا بتادیا۔

''لیکن امام بخش جو بات میں بتانے لگا ہوں۔ وہ سبق آموز ہے۔'' سردار لاشاری بولا۔

''یہ لفظ سننے کو میں ترس گیا تھا کہ کوئی بات آج بھی سبق آموز ہوسکتی ہے۔''

''ہاں ہوسکتی ہے۔ مگر اُس کے لیے آپ جیسا سننے والا چاہیے۔''

''تو میں تو ہوں۔ اب بتاؤ کہ ہندوستان میں تاریخ کیسے بیچی جا رہی ہے۔''

''اگر میں بتادوں تو آپ حیران ہو جاؤ گے۔'' سردار لاشاری نے کہا۔

''تو میں حیران ہونا چاہتا ہوں۔ کہانی میں حیرت ہی تو اصل جوہر ہوتا ہے۔''

''تو پھر آپ حیران ہوں۔ میں حیرانی پیدا کرتا ہوں۔ وہ ایسے کہ جو راجے راجواڑے اور ریاستیں ہندوستان میں تھیں۔ ان کے ساتھ انگریزوں نے جو سلوک کیا وہ تو آپ کو معلوم ہے۔'' سردار لاشاری بول رہا تھا۔

''نہیں مجھے معلوم نہیں۔'' اب کے امام بخش بولا۔

''آپ کو سب معلوم ہے۔ ہندوستان میں راجوں نے قلعے بنائے۔ کس کے خلاف۔ صرف اُن ریاستوں کے راجوں کے خلاف جو قریب کی ریاستوں میں آباد تھے۔ یعنی اپنوں نے اپنوں کے خلاف قلعے بنائے۔ چلو اچھا ہوا؟ لیکن پھر کیا ہوا؟ پھر میر تقی میر نے ایک شعر لکھا:

جو اس زور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

مطلب یہ تھا کہ اگر ہمسائے میں کوئی اتنا زور سے روئے گا کہ کوئی اگلے گھر میں

سونہ سکے گا تو اس کا مطلب کیا ہے؟''

''کیا ہے اس کا مطلب۔''

''اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر کسی ریاست میں خلفشار اور خانہ جنگی ہو گی تو دوسری ریاست آرام سے نہیں رہ سکتی۔ اگر انگریز ایک ریاست میں گھس گیا ہے تو اگلی ریاست خاموشی سے کیسے سو سکتی ہے۔''

''واہ سردار لاشاری۔ تو تو ادب کی جدلیات کو جانتا ہے۔ اب اور بتا ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کی اولادوں کا کیا حال ہے۔'' امام بخش نے جیسے اندازہ لگاتے ہوئے سوال کر دیا۔ اب سردار لاشاری گویا ہوا۔

''دیکھیں جی ہندوستان ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ہر چار قدم پر ایک ریاست پڑتی تھی۔ ریاست کیا ہوتی تھی۔ اُدھر کا ایک خاندان مالک ہوتا تھا باقی سب رعایا۔ اب یہ مالک پر تھا کہ وہ اپنی رعایا کے دل میں گھر کرتا ہے یا اپنے دل میں رعایا کی قبریں کھودتا ہے۔ کتنی ریاستوں نے انگریز کے خلاف ہتھیار اٹھائے۔ بولو امام بخش۔''

اب امام بخش نے جُھرجُھری لی اور اٹھ کر بیٹھنے کے لیے کمر کسنے کی تیاری کی۔ مگر کمر جواب دے گئی۔ مگر آواز میں دم تھا۔

''اب تم نے میری دُکھتی رگ کو چھیڑ دیا ہے۔ ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں بہت پہلے عزیز احمد نے لکھ دیا تھا کہ راجوں اور مہاراجوں نے کیسے انگریزوں کے سامنے اپنی بیویاں پیش کر دی تھیں۔ ان کے کلب کے ممبر بننے کے لیے ان پر زیورات نچھاور کیے تھے۔ جن کلبوں کی ممبرشپ انہیں نہیں دی گئی تھی کیونکہ ان کے دروازوں پر لکھا ہوتا تھا۔

"Dogs and Indians are not allowed."

تو پھر وہ گورے ممبروں کے دوست بن کر اندر جاتے تھے۔ مگر اس کام کے لیے وہ اپنی بیگمات کو تیار کرا کے آگے رکھتے تھے تا کہ گورے ان کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر انہیں

گیٹ کا درجہ دے کر اندر لے جائیں۔'' امام بخش نے یہ بتایا۔

مگر سردار لاشاری نے تو اُس سے آگے کی بات کی تھی۔ اس لیے اُس کے اصرار پر امام بخش نے بتایا کہ ''تاریخ میں زیادہ کردار نہیں ہیں۔ بنگال میں مزاحمت ہوئی سب جانتے ہیں۔ دلّی میں پھانسیاں لگ گئیں۔ غالب بچ گئے مگر اُن کے کئی ساتھی اور استاد تو پھانسی پر لٹکائے گئے۔ مولانا محمد حسین آزاد کے باپ مولانا محمد باقر کو پھانسی لگ گئی۔ مولانا محمد حسین آزاد دیوانے ہو کر پیدل بھاگے اور پاؤں میں چھالے لے کر رقبہ رقبہ، ریاست ریاست چل کر لاہور پہنچے۔''

''امام بخش بابا یہ تو ہم سب جانتے ہیں۔ کچھ اور بتاؤ۔''

''ہاں اب کچھ اور سننے کے لیے حوصلہ چاہیے۔'' امام بخش بولے۔

''تو حوصلہ ہے ناں؟''.... سردار لاشاری نے کہا۔

''تو سُنو یہ جو پنجاب، راجستھان، گوالیار اور آس پاس کے علاقہ ہیں اُن کی ریاستوں کا احوال یہ تھا کہ قلعے بنائے۔ محل تعمیر کیے۔ ہاتھیوں پر سوار ہو کر سالگرہ کے جلوس نکلوائے۔ گھوڑوں پہ بیٹھ کر شیر کے شکار کیے۔ پھر شیروں پر پاؤں رکھ کر تصویریں بنوائیں۔ ان تصویروں کو محلات میں لگوایا۔ رعایا نے چاکری کی۔ کوئی راجپوت، کوئی کنور، کوئی رانا، کوئی ٹھاکر، کوئی راجہ، کوئی راجکمار، کوئی ویر، کوئی مہاویر، کوئی نواب، کوئی سردار کہلایا۔ سب نے پیچ دار مونچھیں اور داڑھیاں اور سر کے بال تہہ در تہہ جمائے۔ پگڑیاں، شملے، تاج، جبے، انگرکھے، خلعتیں اور کامدانی چوغے، شاہی زیورات، گلے میں ہاتھوں میں، پاؤں میں حتیٰ کہ پورے جسم پر اس بوجھ کو ڈالا۔ مگر انگریز کی ایک چتون کا بوجھ نہ سہار سکے۔ انگریز کے سامنے سارے جاہ و جلال، قلعوں اور چوبداروں اور فوجی سردارں، نیزوں تلوارں، توپوں اور بندوقوں کے باوجود مُوت دیا۔ ہاں امام بخش پیشاب کر دیا۔ پشوازیں بھیگ گئیں۔ انگرکھے۔ جبے، جامے سب بھیگ گئے۔ گورے نے جب کہا کہ میں کیمرہ لایا ہوں اور ملکہ

کے دربار میں آپ کی تصویر لگے گی تو ان سب راجوں مہاراجوں نے مونچھوں کو تاؤ دے کر تصویریں بنوائیں۔ بعض نے تو بُھس بھرے شیروں پر پاؤں رکھ کے تصویریں بنوائیں۔ اُسی گورے نے انگریزی فوٹوگرافروں سے کہا۔ ان تصویروں پر وقت ضائع نہ کرنا۔ کام ختم۔'' سردار لاشاری رواں ہو گیا تھا۔

''اس کی خبر تو مجھے ہے۔ جانتا ہوں کہ ان راجوں راجواڑوں نے مزاحمت نہیں کی۔ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ خاموش اطاعت کی۔ اور دھن دولت، زیور جواہر اور قیمتی مال و منال تحفے میں دان دیئے۔ صرف خوشنودی کی خاطر۔'' امام بخش نے نحیف آواز میں کہا۔

''لیکن اب آگے کی سُنو۔ انگریزی شراب محلوں میں داخل ہو چکی تھی۔ راجے مہاراجے اپنی مونچھوں اور شاہی خلعت کو اوڑھے ہوئے۔ شام سے ہی شاہی مطبخ اور خاندانی باورچیوں کو کام پر لگا دیتے ناؤ و نوش چلتا اور جب ہز ہائی نیس لڑھک کر گر جاتے یا پیشاب خطا ہو جاتا یا اُلٹ جاتے تو تب انگریز بہادر داخل ہوتے اور مہارانیوں، ٹھاکرانیوں اور شہزادیوں کی خواب گاہوں کی زینت بنتے۔ صبح تک دادِ عیش دے کر قلعے کی فصیلوں پر غافل سوئے فوجیوں کی مونچھ کے نیچے سے نکل جاتے۔ بالکل ایسے جیسے ہماری داستانوں کی شہزادیاں محل میں سرنگ لگا کر زنگی غلام کو اپنی خواب گاہ میں طلب کرتی تھیں اور صبح تک عیش و نشاط کی سرگم بجتی رہتی تھی۔''

''اچھا تو یہ بھی کسی تاریخ میں درج ہے۔''

''یہ تاریخ ان سپاہیوں کے سینے میں رقم ہے جو پہرے پر ہوتے تھے۔'' سردار لاشاری نے کہا۔

''کسی نے یہ درج کیا۔'' امام بخش بولا۔

''امام بخش ان راجواڑوں کی بڑی مونچھوں کے نیچے اُن کی بُزدلی کے تمام راز اب آشکار ہیں۔ انگریزوں نے ان کے سارے بھید صرف ایک ریاست کو فتح کرنے کے

بعد پالیئے تھے۔ باقی ریاستوں کو ہڑپ کرنے میں انہیں دیر نہ لگی۔ مگر ایک عورت بیچ میں آ گئی جسے وہ سمجھ نہ سکے۔"

"اب تم قصہ لمبا مت کرو۔ اب یہ عورت جھانسی کی رانی ہو گی۔ مجھے معلوم ہے۔ آگے بڑھو" یہ امام بخش بول رہا تھا۔

"ہاں اُس رانی پر ہندوستان کو ناز ہونا چاہیے۔ جس ہندوستان میں موجودہ پاکستان بھی تھا اور اُس مسلمان پیر بخش پر بھی ناز کرو جو سپہ سالار تھا رانی کا اور وہ بھی جو توپ چلاتا تھا۔ تانتیا توپی کے نام سے اُسے تاریخ یاد رکھتی ہے۔" سردار لاشاری بولا۔

"جن ٹھاکروں، مہاراجوں، کنوروں، رانوں، راجپوتوں کو رانی آف جھانسی نے آئینہ دکھایا۔ ان کی موچھیں اب بازاروں میں چار چار آنے میں نقلی بنا کر بیچی جا رہی ہیں۔ لگاؤ اور آئینے میں دیکھو۔" امام بخش مسکرایا۔

"امام بخش بات ختم نہیں ہوئی۔ تاریخ کروٹ لیتی ہے اور تاریخ آج کے زمانے میں آنکھیں کھولتی ہے۔"

"اوئے سردار۔ تاریخ کی آنکھیں نہ کھولنا۔ تاریخ ڈر جائے گی جو کچھ ہوا ہے؟"

"مگر تاریخ کیسے گونگی اور اندھی ہو سکتی ہے۔ اُس کو سب دکھائی دیتا ہے۔"

"تو پھر جو تاریخ دیکھتی ہے ہمیں بھی دکھا دے۔"

"آج کی تاریخ نہ گونگی ہے نہ بہری ہے۔ اُس کو ہزاروں چینلز دکھا رہے ہوتے ہیں۔ اب تاریخ ٹی وی چینلز، گوگل، فیس بک اور ٹوئیٹ پر بے نقاب ہو چکی ہے۔"

"مگر میں یہ سب نہیں جانتا۔ کھاٹ پر پڑا ہوں۔" امام بخش نے کہا۔

"ہاں مگر زمانہ بدل چکا ہے۔ اس لیے ان راجواڑوں اور ریاستوں کے ساتھ جو ہوا ہے وہ بتانا ضروری ہے۔"

"تو بتاؤ۔"

''ہاں آج اُن راجواڑوں کی حالت یہ ہے کہ سب محل، قلعے اور جائیدادیں نشانِ عبرت بن چکی ہیں۔ مگر آج کی Marketing- Consumerism اور کمرشل دیوتاؤں کا کمال ہے کہ گلوبلائزیشن کو یہی رجواڑے طاقت فراہم کرر ہے ہیں۔'' سردار لاشاری چیخ رہا تھا۔

''ہاں مگر ہوا کیا ہے؟''

''ہوا یہ ہے کہ ہزاروں چینل ٹی وی کے کُھل گئے ہیں جن میں زیادہ کی تعداد ٹریول چینل، باورچی چینل اور سفاری چینل سے لے کر تاریخ کے چینل تک سامنے آگئے ہیں اور سب کے سب کیا بیچتے ہیں؟''

''مجھے کیا پتہ کیا بیچتے ہیں۔''

''وہ سب صرف اور صرف انسان کی بھوک بیچتے ہیں۔''

''بھوک؟''

''ہاں امام بخش سب کے سب ہماری ہر طرح کی بھوک بڑھانے میں دن رات نئے ہتھکنڈے استعمال کرر ہے ہیں اور ان راجواڑوں کی بچی کھچی اولادیں اپنے ماضی کے مزاروں پر بیٹھ کر بزرگوں کے قصیدے پڑھنے کے ساتھ ساتھ گوروں اور گوریوں کو رائل کوزین کے خاندانی اور پوشیدہ صدری نسخے اپنے رائل کچن میں تجربہ کر کے دستر خوان پر کھلانے کو اپنا اعزاز تصور کرتے ہیں۔''

''گویا شاہی باورچیوں کی جگہ راجوں مہاراجوں کی اولادوں نے لے لی ہے۔ کیسی بلندی کیسی پستی۔''

اور وہ بڑے فخر سے اپنے محلات اور قلعوں میں قائم ہوٹلوں اور ریستورانوں میں لگی تصویریں دکھاتے ہیں۔ شیر پر پاؤں رکھے ٹھاکر صاحب مونچھوں کو تاؤ دے رہے ہیں۔ کسی چیتے پر پاؤں رکھے مہاراجہ اپنی پگڑی اور زیورات پہنے مسکرار ہے ہیں۔ کسی

تیندوے کی بُھس بھری چمڑی پر بندوق رکھے مونچھوں اور داڑھی کے بیچ مشکل سے معلوم سے پڑتا ہے کہ مسکرا رہے ہیں یا جان لبوں پر آئی ہوئی ہے۔''

''ہندوستان کے راجوں نے اپنی ذات اپنے خاندانی تسلسل کو جاری رکھا مگر بھول گئے کہ انگریز نے اُن کے لقب اُن کے ریاستی اختیارات، اُن کی شناخت تک چھین لی تھی۔ اُن کے بچوں کو انگلستان پڑھنے کے لیے ضرور بھیجتے تھے مگر انہیں وہی کاٹھ کا غلام بنا کر بھیجتے تھے۔ تعلیم کا نظام تو ان کے ہاتھ میں تھا۔'' امام بخش کی تاریخی حس پھڑکی اور جب وہ پھڑکتی تھی تو وہ رُک نہیں سکتی تھی۔ وہ لاہور، دلّی اور بمبئی کے ساتھ کلکتہ میں ایسے کالج کھول چکے تھے جو حاکم اور غلام پیدا کرنے کے الگ الگ نصاب رکھتے تھے۔''

''امام بخش یہ کوئی نئی بات ہے۔ اب مجھ سے سُنو۔ انگریز نے کلکتہ میں یونیورسٹی بنائی اور پھر لاہور میں ایچی سن کالج بنایا۔ بھلا کس لیے۔''

''کس لیے۔'' امام بخش بولا۔

''اس لیے کہ پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ کے راجوں کے بچے وہاں آ کر حکومت کرنے کے سارے آداب حاصل کریں اور پھر یہ طے ہوا کہ اس کالج سے تربیت کے بعد یہ لاڈلے انگلستان بھیجے جائیں گے جہاں وہ گوروں جیسی حکمرانی کے داؤ پیچ سیکھ کر آئیں گے۔ لیکن امام بخش انگریز نے سوچا کہ اگر حکمران تیار کر لیے تو اُن کا دفتری عملہ کون تیار کرے گا۔ اس پر انہوں نے جلدی میں ایک کالج قائم کیا۔ اُن کے نزدیک وہ کالج سیکرٹریٹ کے لیے عملہ تیار کرنے کے لیے ضروری تھا۔ اُس کا الحاق لاہور سے کلکتہ یونیورسٹی میں کیا گیا۔ بھلا کیا نام تھا اُس کالج کا۔'' سردار لاشاری اب غصے میں بولا۔

''ہاں جانتا ہوں۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور یہ بھی جانتا ہوں یہ سب عجلت میں ہوا اور حویلی دھیان سنگھ میں اس کی کلاسیں شروع ہوئیں اور پھر کیا ہوا؟''

''ہاں سب جانتے ہیں۔ اس کالج نے وہ کام کیا جو گورے نہیں چاہتے

تھے۔ وہاں سے غلام نہیں مفکر، شاعر، افسانہ نگار، موسیقار، فلسفی اور نفسیات دان پیدا ہونے لگے۔ مگر اُس وقت گورا جا چکا تھا۔''

''تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ آج ایچی سن کالج اُسی طرح راجوں، مہاراجوں کی اولادوں کو اُگل رہا ہے۔ مگر گورنمنٹ کالج لاہور کو کنزیومر ورلڈ نے نگل لیا ہے۔ اُسے یونیورسٹی بنا کر اپنے مطلب کے پُرزے اور غلام نکالنے شروع کر دیئے ہیں۔'' لاشاری بولا۔

''تو اب میرا بھی اخیر وقت چل رہا ہے۔ سُن لو۔ ایچی سن کالج کے راجوں دُلاروں کو بھی اب زوال ہے۔ گھوڑ سواری اب کام نہیں آئے گی کہ پاکستان میں ایک نیا کلچر آ چکا ہے جو اب خاندانوں کی شناخت سے زیادہ دولت کی شناخت کا ہے۔ اب سکّہ کھنکھنائے گا بے شمار مافیا آ گئے ہیں اور سب کو احتساب کا سامنا ہے۔ مگر احتساب بھی ان کا ہوگا جو دولت کی چوری کے بدلے دولت ہی کو ڈھال بنائیں گے۔ تو بولو انگریز اب بھی پاکستان میں موجود ہے یا نہیں ہے۔ اور یہ بھی جان لو کہ راجے راجواڑے اگر اپنی سبزیاں اور مرغیاں رائل کوزین کے نام پر بیچ رہے ہیں تو اِدھر پاکستان میں بھی بڑے خاندان فوڈ سٹریٹس میں سرمایہ لگا رہے ہیں۔ ایم ایم عالم روڈ، ڈیفنس، ماڈل ٹاؤن اور امیر آبادیوں میں سب باورچی بن جائیں گے۔'' یہ تھا آخری خطاب جو امام بخش نے دیا۔

ہوا یہ کہ اُس شہر کی سیاست بھی ملکی سیاست کے ساتھ جڑی ہوئی تھی اور اب جس کے پاس دولت کی کنجی تھی وہی شہر کی کنجی حاصل کر سکتا تھا۔ تو پرانی ذاتیں ناکام ٹھہریں اور جو نوزائیدہ ذاتیں اُبھریں وہ چھا گئیں۔ ایک منظم طریقے سے جمہوریت کو اپنا غلام بنانے کے

لیے پاکستان میں سائنسی بنیادوں پر کام ہونے لگا۔امام بخش کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جب اُسے پتہ چلا کہ صحافی، رپورٹر اور کالم نویس بھی گماشتے ہو سکتے ہیں اور وہ اس پاور پلے میں انتہائی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ پہلے تو لفافے کا کلچر چلایا گیا۔مطلب صحافیوں اور کالم نویسوں کو مختلف طریقوں سے لفافے تقسیم کیے گئے۔ بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ ہماری جمہوریت میں ٹی وی چینلز بھی داخل ہو گئے۔اب وہاں پر ہر چینل نے جمہوریت کو قابو کرنے کے لیے اور اپنی ریٹنگ بڑھانے کے لیے ایسے لوگوں کو لاکھوں روپے دیہاڑی پر رکھ لیا جو شام کو جمہوریت کے نام پر دنگا کر سکتے تھے۔اپنی آواز اور اپنے آگ لگا دینے والے تجزیوں سے کروڑوں انسانوں کی نیند حرام کر سکتے تھے۔

اپنی ڈفلی بجانے لگے۔اب ایسے میں ایک لینڈ مافیا نے تو وجود میں نہیں آنا تھا۔اپنے ساتھ بہت سے مافیا کو اپنی چھتری تلے جگہ دے دی۔چنانچہ دولت کے تڑکے نے سیاست کو ایک بہت بڑی تجارت میں تبدیل کر دیا۔اب شہر کی سیاست اُن تاجروں اور سرمایہ کاروں کے ہتھے چڑھ گئی جو کبھی پناہ گیر ہو کر آئے تھے اور اب وہ سیاست کے ایوانوں میں اربوں، کھربوں ڈالر کے سودے کرنے میں مصروف ہو گئے۔اور صحافت اُن کی باندی بن گئی۔یہ صحافی بھی ارب پتی مافیا کی صورت اختیار کر گئے۔

امام بخش کا شہر بدل گیا۔امام بخش کھاٹ سے لگ چکا تھا اور صبح ہونے پر وہ کھاٹ اوپر چوبارے سے نیچے ڈیوڑھی میں آ جاتی اور کوئی بھولا بسرا سنگی ساتھی یا کوئی تاریخ کا مارا ہوا آ دھمکتا تو کچھ دیر پرانی یادوں میں سانس لینے کا موقع مل جاتا۔کبھی سوچتا کہانیوں کے اس شہر میں اب کون کہانیاں سناتا ہوگا۔یا نئی کہانیوں کا جنم کیسے ہوتا ہوگا۔وہ حیرت کدے خاموش ہو گئے ہوں گے یا وہاں اب بھی الاؤ جل رہے ہوں گے۔ ہزاروں سالوں کے قبرستان اُسی طرح خاموش پڑے تھے بلکہ خاک آلودہ ہو چکے تھے۔پرانے محلے کٹڑے، کٹڑیاں، گلیاں، کوچے، چوبارے قطار اندر قطار اُسی طرح ایستادہ تھے مگر زمانے اُن پر

ایسے گزرے کہ پہچانے نہیں جاتے تھے۔ اب گرے کہ اب گرے۔ مگر مخلوق ان میں اُسی طرح آباد، سانس بھی لے رہی تھی کسی گھر کی کھڑکی کھسک گئی تو ادھورے پٹ کے پیچھے سے دو پراسرار آنکھیں گلی کی طرف دیکھتی رہتی تھیں۔ کہیں کسی جھروکے کے پیچھے روشن چہرہ لَو دیتا ہوا دیکھا جاسکتا تھا۔ یوں شہر کا شہر سہما سمٹا موجود تھا۔ مگر جو نکل سکتے تھے نکل گئے۔ جو نہ جاسکے وہ اداسی اوڑھ کر اُسی آسیب کا حصہ بن گئے۔ یوں گلیاں آباد تھیں۔ مگر آتے جاتے سائے ہی تھے جو گھٹتے بڑھتے دکھائی دے جاتے تھے۔ امام بخش منیر نیازی کے شعر میں بصیرت تلاش کرنے کے ساتھ اپنی موجودگی کو بھی محسوس کرنے لگا۔

اِک چیل ایک ممٹی پہ بیٹھی ہے دھوپ میں
گلیاں اُجڑ گئی ہیں مگر پاسباں تو ہے

امام بخش کی روح کیوں اٹکی ہوئی تھی۔ اب اس جنم میں نہ کوئی اُس کی باتیں سننے والا رہا نہ اُس کے اندر جوش رہا نہ محفلیں نہ تکیے نہ مجلسیں نہ صحبتیں نہ چائے خانے نہ دیوان خانے اور نہ شبانے رہے۔ چکلے سمٹے گئے چکلے دارنیاں کہیں اور کو نکل گئیں۔ رنڈی خانے اُجڑ گئے۔ رنڈیاں کچھ تو شہر کے اُجڑے بجڑے سینماؤں میں سستے تھیٹروں میں ان کا ہکوں کے لیے کام کی تلاش میں آ گئیں جو دکانیں سمیٹ کر شام کو شراب کی شیشی کے ساتھ عطر پھلیل لگا کر ان تھیٹروں کا رُخ کرنے لگے تھے۔ مجروں کے لیے بالا خانے نہ سہی۔ سستی ٹکٹ میں یہ سینما ہال ہی سہی جہاں ایک نہیں آٹھ آٹھ مجرے روزانہ رات کو مل جاتے تھے۔ کچھ جو ذرا ٹھسّے والی ڈیرے دارنیاں تھیں وہ بڑے شہروں کو اُٹھ گئیں جہاں ذرا بہتر مواقع کوٹھیوں اور بنگلوں میں میسر آسکتے تھے۔ اب امام بخش کو کس کہانی کی تلاش تھی۔ تاریخ سے مُردہ شہزادیوں کے قصے کریدنے کا شوق بھی ماند پڑ چکا تھا کہ کوئی دلچسپی لینے والا جو نہیں رہا تھا۔ نواب، جاگیردار، زمیندار، منصب دار سب اُٹھ گئے۔ تجارت کا زمانہ تھا۔ بھلا تاجر کسی کو کیوں گھر بٹھائے گا۔ کیوں رنڈی کا کنبہ پالے گا۔ انہیں تو فارم ہاؤسوں میں، فائیوسٹار

ہوٹلوں میں ہر طرح کی ماڈلز اور اداکارائیں وافر تعداد میں مل سکتی تھیں۔ اس لیے امام بخش کو کس نے مرزا ہادی رُسوا کا درجہ دینا تھا۔ قصہ گو اپنے زمانے کو ترس گیا۔ مگر اُسے انتظار تھا کہ کوئی آئے گا۔ کوئی اُس کی تلاش میں آئے گا۔

بھلا کس نے آنا تھا۔ امام بخش اُن پرندوں کی طرح کی فطری دانش رکھتا تھا جو موسموں کی تبدیلی کو پہلے سے بھانپ لیتے ہیں یا آنے والے واقعات کے لیے خود کو پہلے سے تیار کر لیتے ہیں۔ اُسے معلوم تھا کوئی آئے گا اُس کی تلاش میں اور پھر ایک دن جب اُس کی کھاٹ کو ڈیوڑھی میں لا کر رکھ دیا گیا اور وہ باہر گلی میں آنے جانے والوں کو معمول کے مطابق دیکھنے لگا۔ کچھ بھی گلی میں نہیں بدلا تھا۔ کوئی خوانچے پر گول گپے والا گزرا۔ آواز نہیں لگائی کہ آواز اُس نے وہاں لگانی ہوتی تھی جہاں اُس کا اڈا ہوتا تھا۔ وہاں سے تو وہ ایسے ہی گزر جاتا تھا۔ گویا یہ تو اُس خوانچہ فروش کا راستہ تھا۔ ایک بار ایسا بھی ہوا کہ کسی چٹخورے نے جب خوانچہ دیکھا اور گول گپے سجے دیکھے تو مچل گیا اور پکارا۔ ''گول گپے والے.....'' ابھی کچھ اور کہا ہی نہیں کہ اُس نے سُنی اَن سُنی کر دی اور چلنا جاری رکھا۔ تو وہ چٹخورہ آگے بڑھا راستہ روکا۔ ''گول گپے والے، گول گپے چاہئیں۔''

''نہیں.... گول گپے کھانے ہیں تو میرے اڈے پر آؤ۔ چوک آئے گا آگے ایک طرف سینما ہے۔ اُس کے بازو میں ہم بیٹھتے ہیں میاں۔ ہم خوانچہ وہاں ٹکاتے ہیں۔ تم وہاں آؤ میاں تو پلیٹ آگے دھر دیں گے اور آپ کو گول گپا ایسے بنا کہ دیں گے کہ سیدھا ہاتھ سے آپ کے منہ میں جائے گا۔ ارے ہم یہاں دلّی والے ہیں جہاں کا میر باقر علی قصہ گو مشہور تھا۔ وہ قصہ ایسے سناتا تھا جیسے کوئی خواب میں قصہ سن رہا ہو۔'' اب وہ جو چٹخورا تھا یہ سُن کر ہوا ہو گیا۔ شہر کے سب خوانچہ فروشوں کا اصول تھا کہ راہ میں گاہک مل بھی جائے تو رُکنا نہیں منزل کھوٹی نہیں کرنی۔ اپنے اڈے پر جا کر اڈا جمانا ہے اور پھر جو گاہک آئے گا اُس کی خدمت ایسے کرنی ہے کہ وہ یاد کرے کہ کوئی سودا بیچنے آیا تھا اور سودا نہیں بیچا جان کا سودا

کر کے گیا ہے۔

اب امام بخش نے ڈیوڑھی کے دروازے سے دیکھا ایک پانڈی سر پر سامان لے کر نکلا تو امام بخش سوچنے لگا اس نے سر پر کیا اٹھا رکھا تھا۔ جب تک معلوم نہیں پڑے گا امام بخش کو سانس نہیں آئے گی۔ اب معلوم کیسے پڑے گا کہ کوئی نہ پیچھا کرنے والا نہ بتانے والا کہ کون پانڈی گزرا کسی کا سامان لے کر۔ کیا کسی دلہن کے جہیز کا سامان تھا۔ یا کسی پنساری کا سامان تھا جو دکان کے لیے لے کر جایا جا رہا تھا۔ یا کسی منڈی کا مال تھا جسے پانڈی نے اٹھا رکھا تھا۔ بس تو یہ دماغی حالت تھی امام بخش کی کہ وہ کسی بھی سامنے سے گزرنے والے کو دیکھ کر یا ماضی میں چلا جاتا تھا یا حال میں یا مستقبل میں۔ اس کے لیے زمانے گڈمڈ ہو گئے تھے۔ امام بخش زمانوں کو تجربہ گاہ میں لے جا چکا تھا۔ اب ڈیوڑھی کا کردار تین زمانوں تک رسائی رکھتا تھا۔ شہر میں کوئی ایسا دانش ور نہیں تھا جو امام بخش کو سنبھال سکتا۔ کہ وہ تو رواں دریا تھا اور دریا بھی ایسا کہ اپنی مرضی سے بہتا تھا۔ تو اب جو بھی اُس کی ڈیوڑھی کے سامنے سے گزرتا تھا وہ اُس کا قیافہ لگا کے خیال افروزی کرنے لگتا تھا کہ اگر برقع میں کوئی لڑکی گزری ہے تو وہ کہاں جا سکتی ہے۔ کالج میں یا کہیں اور اگر کالج گئی ہے تو رستے میں کسی کے سکوٹر پر تو نہیں بیٹھ گئی۔ یا کسی کی جیپ میں تو نہیں گئی۔ یہ ایک انوکھا کھیل تھا جو امام بخش اپنے سے کھیلتا رہتا تھا۔ اس لیے کہ کچھ بھی تو سوچنے کو نہیں تھا۔ ایسے میں کبھی کبھی کوئی جنازہ بھی گزر جاتا تھا۔ وہ سوچتا کون اس گلی میں فوت ہوا ہے۔ کوئی بزرگ تھا تو شاید اس کا جاننے والا ہو گا۔ کوئی خاتون تھی یا کوئی جوان۔ کبھی کبھی کوئی ادھر کا رُخ کرتا تو پوچھ لیتا۔ ایسے میں ایک دن ایک لڑکی جو اس شہر کی نہیں لگتی تھی کیونکہ اُس نے پتلون اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پر خوبصورت چشمہ اور برائے نام شال اوپر لے رکھی تھی۔ بال بھی ایسے بنائے ہوئے تھے جو کسی یورپی ملک کے رہنے والوں کے ہوتے ہیں۔ وہ پوچھتی پچھاتی ڈیوڑھی میں آ گئی۔ امام بخش کو لگا مجھے جس کا انتظار تھا وہ یہی لڑکی ہو گی۔

اُس نے سلام کیا۔ بہت شائستگی سے کلام کیا۔ معلوم ہوا اُسے ہماری زبان بھی آتی ہے۔

''آپ امام بخش صاحب ہیں۔''

''ہاں۔ میں ہی امام بخش ہوں۔''

''شکر ہے آپ زندہ ہیں۔ ماں کو معلوم نہیں ہے کہ آپ زندہ بھی ہوں گے کہ نہیں۔''

''کبھی کبھی بندہ زندہ نہ بھی ہو تو زندہ ہوتا ہے اور کبھی انسان مر کے بھی زندہ ہی رہتا ہے۔''

''سمجھ سکو تو۔''

''ماں نے غلط نہیں کہا تھا کہ کچھ ہے آپ کے پاس۔ کچھ پرانے زمانوں کی باتیں ہیں۔''

''باتیں نہیں۔ راکھ ہے اب تو۔''

''میں وہی راکھ کریدنے آئی ہوں۔''

''تمہاری ماں کا کیا نام ہے۔''

''ایسی ماؤں کے نام نہیں ہوتے جو بِن باپ کے بچوں کو جنم دیتی ہیں۔ کچھ بھی سمجھ لیں۔ کوٹھے پر بیٹھتی تھی جسے مرد لوگ چکلہ کہتے ہیں۔''

''نین نقش سے تو میں سمجھ رہا ہوں کہ تم......''

''نہیں نین نقش میرے ماں پر نہیں گئے۔ وہ کہتی تھی میں کسی نواب کی اولاد ہوں۔ جس نے مجھے اپنا نام نہیں دیا۔''

''خیر جان کے کیا کرنا ہے۔ اب تو چہرے بھی دھیان میں نہیں رہے۔''

''ماں کی گود میں تھی جب ماں نے سوچا چکلے پر میری بیٹی کا مستقبل کیا بنے گا۔ سو

اُسے اچانک ایک دن پاکستانی فلموں کا ایک پاپی سرمایہ کار مل گیا جو بظاہر تو کسی ہیروئن کی تلاش میں اُدھر آ نکلا تھا جسے وہ اپنی نئی فلم میں لینا چاہتا تھا۔ رہتا امریکہ میں تھا کہ چالاکی سے اُس نے وہاں بھی پاکستانی فلموں کے فلمساز کا لبادہ اوڑھ کر مقامی ریسٹورانوں اور چھوٹے موٹے کاروبار کرنے والے پاکستانیوں کو ایک خواب میں الکا رکھا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی پاکستانی فلموں کی کسی بھی ہیروئن کے ساتھ وقت سے لذت کشید کر سکتا ہے۔ چاہے وہ کوئی بابرا ہو، ریما ہو، میرا ہو یا نرما ہو۔ اپنی اس چالاکی میں وہ کامیاب اس لیے تھا کہ ایک تو اُس کی شکل کا چوکھٹا فلمی ہیرو کے عین مطابق تھا مثلاً رنگ گورا، ماتھا چوڑا، بال محمد علی جیسے بلکہ اُن کی وگ جیسے۔ لباس میں سفید پتلون، سفید جوتے اوپر رنگین قمیص گلے میں مفلر۔ سر پر کبھی کبھی سفید ہیٹ۔ اب ایک خبر یہ بھی تھی کہ ایک آدھ فلم میں ناکام ولن بھی آیا تھا اور پھر امریکہ نکل گیا۔ بہت بُرا وقت گزارا اور پھر چار پیسے کمانے کے بعد کچھ اور لوگوں کا سرمایہ لے کر پاکستان آیا اور کسی ڈائریکٹر پر بھروسہ کیا جو سلطان راہی کی فلموں سے نام کما چکا تھا۔ اور پھر اس بہانے کچھ تماش بینی کی کچھ اپنے ناکام ولن ہونے کا بدلہ لیا اور پھر فلمسازی کی تہمت لے کر مقامی اخباروں میں شو بزنس کے رپورٹروں کو اپنے ہوٹل میں بلا کر پاکستانی شراب پلا کر خبریں لگوانے کی وجہ سے تھیٹر میں پھنسی ڈانسرز اور فلموں کے ناکام ہونے کی وجہ سے مایوس اداکاراؤں تک آسانی سے رسائی حاصل کر لی۔ اس میں میری ماں بھی شامل تھی۔''

''بیٹی تم نے تو قصہ گو کا مقام لے لیا ہے۔'' یہ امام بخش تھا جو اس لڑکی کی باتیں سن کر ماضی میں جا چکا تھا اور اُسے کہانی کا نشہ آج مل رہا تھا۔

''انکل یہ وہ بات ہے جو اماں نے مجھے بتائی تھی۔ اس میں قصے کا کچھ چکر نہیں ہے۔ مجھے ماں کی باتیں ایسے لگتی ہیں جیسے اُس نے مجھے دودھ پلاتے ہوئے یہ باتیں اُس دودھ میں گھول دی تھیں۔''

اب یہ تو اور بڑا انکشاف تھا جو امام بخش نے محسوس کیا۔ اس کا مطلب یہ کہ جو سچ ہے وہ کسی ملمع کاری کا محتاج نہیں ہے۔ امام بخش نے لڑکی سے کہا کہانی جاری رکھو۔

''یہ کہانی نہیں انکل یہ میری ماں کی حقیقت ہے۔ اور میں یہی تو بتانے آئی ہوں کہ فلمی سرمایہ کاری کے نام پر وہ اماں سے ملا۔ اُس نے اپنی بیوی اور دو بچوں کو پاکستان میں چھوڑ کر امریکہ میں اپنا ٹھکانہ بنایا۔ پہلے تو بیوی بچوں کو آسرے میں رکھا کہ جلدی بُلا لے گا۔ لیکن اُس کے عزائم بلند تھے اور اس کی شخصیت پست تھی۔ اس لیے جلد ہی بیوی کو طلاق دے کر فارغ کیا اور بچوں کو پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔''

''تو پھر تمہاری ماں کو اُس نے کیسے شیشے میں اُتارا۔'' اب امام بخش کی باری تھی۔

''اماں کے پیٹ میں کیڑے کی طرح میں پَل رہی تھی اور پیٹ میں سرسرا رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ چکلے میں بیٹھی عورت کو پیٹ کا روگ نہیں پالنا چاہیے۔ سوائے اس لیے کہ پیٹ میں لڑکی ثابت ہو جائے۔ مگر اُس وقت پیٹ میں لڑکی ثابت ہونے کا شاید فارمولا آ چکا تھا مگر چکلے تک نہیں پہنچا تھا۔ اس لیے اماں نے جب ایک خوبصورت اور تیز طرار نجات دہندہ کو دیکھا تو کچھ فیصلہ نہ کر پائی۔ بس اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا کہ وہ شخص سیدھا امریکہ کی فلائٹ پر نکلنے والا تھا۔ اب اماں نے صرف امریکہ کا نام سنا تھا۔ جس کا کوئی آگا نہ ہو پیچھا نہ ہو۔ ایک طرف شیطان ہے اور دوسری طرف گہرا سمندر ہے۔ (Between the devil and the deep Sea) وہ کیا کرتی۔ وہ آنکھیں بند کر کے اُس کے ساتھ نکل گئی۔ ظاہر ہے پاسپورٹ بنا۔ میرا نہیں کہ میں تو امریکہ میں پیدا ہوئی۔ اب اماں امریکہ میں اُس فلمساز کے اپارٹمنٹ میں آ گئی جو شاید کئی طرح سے خود کو امریکہ میں قدم جمانے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ مقامی آبادی میں وہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ پاکستان کے سیاست دانوں، اداکاروں، مشہور لوگوں اور کالم نگاروں کا ذاتی دوست ہے۔ اس کام کے لیے وہ اُن کے ساتھ اتروائی ہوئی تصویروں کی البم ہر وقت اپنے ہینڈ بیگ میں رکھتا تھا۔ جلد ہی اماں کو

معلوم ہو گیا اُس کی اوقات کیا ہے۔ وہ فلموں کا سرمایہ کار نہیں تھا۔ وہ فلمی ہیروئنوں کا جھانسا دے کر امریکہ میں ہوٹلوں اور گوشت سبزی کی دکانوں کے پاکستانی مالکان کو سبز باغ دکھاتا تھا اور لاہور کے مشہور ڈائریکٹروں سے فون پر بات کراتا تھا۔ وہ ڈائریکٹر دراصل فلمی سٹوڈیو کے مالکان کے گماشتے ہوتے تھے۔ کوئی کسی کا دلال تھا۔ کوئی کسی کا بھڑوا تھا۔ اماں کو آہستہ آہستہ سمجھ میں آنے لگا۔ وہ بہت کاری گر تھا۔ مقامی پاکستانیوں کو ہیروئنوں کے لالچ میں فلموں میں سرمایہ کاری پر راضی کرتا اور لاہور لے جاتا۔ پہلی قسط کے طور پر بیس لاکھ ایڈوانس ڈائریکٹر کی گود میں جس میں سے پانچ لاکھ اس کا حصہ ہوتا تھا۔ باقی کے پندرہ لاکھ میں ہیروئن ایک دو راتوں کے لیے اُس سرمایہ کار کے ہوٹل میں رہتی تھی۔ اُس ہیروئن کا لالچ رات کا معاوضہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہیروئن ان سرمایہ کاروں کو مزید لُبھا کر مستقبل کے لیے اپنا راستہ امریکہ میں تلاش کر رہی ہوتی تھی۔ یہ ایک منظم جال تھا۔ اب بیس لاکھ میں فلم کی مہورت، اخباری خبریں، پھول پتی، ایک ادھورے گانے کا ٹکڑا رائٹر کا ایک منظر سب اسی پیکیج میں شامل ہوتا تھا۔ ان بیس لاکھ میں پانچ لاکھ تو سرمایہ کاری کے لیے امریکہ سے بیوقوف دکاندار کو لانے والے کا ہوتا تھا۔ مطلب اُس کا جو میری اماں کا خاوند بن چکا تھا۔

''یہ ساری باتیں تمہیں اماں نے بتائیں اور تم نے یاد رکھ لیں۔'' اب امام بخش حیران ہوا۔

''انکل اماں نے جو بتایا وہ بچپن سے اب تک میں نے اپنے اندر محفوظ کر لیا ہے۔ یہ مجھے آگے بھی کام آئے گا۔'' یہ اُس لڑکی نے بتا دیا۔

''تو اب آگے بڑھو بیٹا۔'' امام بخش نے داستان لڑکی کے حوالے کر دی۔

''تو پھر یہ ہوا کہ وہ شخص اماں کے سامنے ننگا ہو گیا۔ ضروری نہیں بندہ کپڑے اتار کر ننگا ہوتا ہے۔ بندہ اپنی کینچلی اتار کر بھی ننگا ہو جاتا ہے۔''

''اب یہ تو تم نے بڑی اہم بات کی ہے۔'' امام بخش بولا۔

"انکل میں ابھی پیدا ہوئی تھی کہ یہ سب ہو رہا تھا، تو یہ سب میرے دودھ کے ذریعے شامل ہو گیا۔ پہلے بھی بتایا ہے۔"

"اب نہیں روکوں گا۔ بولو۔"

"تو ایسا ہوا کہ وہ آدمی اس طرح سے کئی ہیروئنوں کے شوقین لاہوریوں کو امریکہ سے لاہور لے گیا اور بعد میں ثابت ہوا کہ فلم کا آغاز بیس لاکھ سے ہوا اور پھر فلم بند ہو گئی کیونکہ یہ محض ایک جال تھا۔ نہ کہانی نہ رائٹر نہ ڈائریکٹر۔ تو خیر اس طرح ہماری فلم انڈسٹری اپنے انجام کو پہنچی۔ مگر میرا یہ موضوع نہیں ہے۔ میری اماں پر راز اُس دن کھلا جب وہ باہر سے بے عزت ہو کر آتا تھا اور شراب پیتا تھا اور بہت سی شراب پی کر آتا تھا۔ میں تین سال کی تھی کہ میں نے دیکھا وہ میری ماں کو مارتا تھا۔ وہ سہہ لیتی تھی۔ ایک دفعہ اُس نے اماں کے منہ پر کئی طمانچے مارے تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے اُس کے ہاتھ پر دانت گاڑ دیئے ایسا زور کا کاٹا کہ اُس نے اُلٹا مجھے تھپڑ مار دیا۔

اب اس معمول میں یہ معلوم پڑا کہ وہ جو اماں کو سبز باغ دکھا کے لایا تھا۔ اب اُس کا ملمع اُتر چکا تھا اور وہ مفت کی پیتا تھا اور مفت میں بے عزت ہوتا تھا۔ پاکستان کی فلم انڈسٹری نے بڑے بڑوں کو بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا تو یہ کس باغ کی مولی تھا۔ اب وہ جو میرا باپ بنا ہوا تھا۔ اپنے پرانے سوٹ پہن کر باہر جاتا تھا کہ شاید پاکستان کمیونٹی اُسے اپنے ساتھ بٹھالے یا کھانے کی میز پر اُسے کھانے کی دعوت دے دے۔ مگر اس کی کوئی نوبت نہ آئی اور اماں نے گزارے کے لیے ایک ریسٹورنٹ میں شراب کی بار پر نوکری کر لی۔ میں اب سکول سے ہائی سکول اور کالج کی طرف رواں تھی۔ اماں کا سب سے بڑا خواب میں تھی کہ وہ کسی طرح امریکہ میں رہنے کا فائدہ میری صورت میں اُٹھالیں۔ اس لیے کہ اُن کی اپنی زندگی تو نہیں رہی تھی۔ اب میں پڑھ رہی تھی اور وہ شراب کی بار میں کام کر رہی تھی۔ مگر ایک دن کیا ہوا کہ وہ جو اماں کا خاوند تھا وہ اُس بار تک پہنچ گیا اور....

''اور مجھے پتہ ہے اُس نے کیا کیا ہوگا؟'' یہ امام بخش تھا جس نے کہانی روکی۔

''ہاں وہ آیا اور اُس نے غدر مچا دیا۔ مگر وہاں پولیس اور گارڈ تھے جنہوں نے اُسے اُٹھا کر جیل میں ڈال دیا۔ اماں کو معمولی زخم آئے۔ وہ رات بارہ بجے ڈیوٹی سے گھر آتی تھی اور میں جاگ رہی ہوتی تھی۔ وہ مجھے سُلاتی اور پھر سو جاتی تھی۔ یہ وقت اماں نے بڑی ہمت سے گزارا۔ مجھے اب یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ جہاں فلم کا شعبہ تھا۔ مجھے فلم کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن میں گھر میں اکیلی ہوتی تھی تو دنیا جہان کی فلمیں دیکھتی رہتی تھی۔ کسی طرح سے یہ مجھے مل جاتی تھیں۔ اماں تھک کے آتی اور گر جاتی تھی اور اُن کی صحت بھی اب گرنے لگی تھی۔''

''کہانی کا انجام ابھی نہیں کرنا۔'' یہ امام بخش تھا جو بولا۔

''ابھی انجام میں کیا رہ گیا ہے۔ ایسے قصوں کا انجام بھی کوئی انجام ہوتا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں ہوتی ہاں نئی بات ہے جو ابھی آنی ہے۔''

''دیکھا پھر کہانی کا گھونگھٹ نکال دیا۔ اب تو دیکھنا ہوگا۔''

''ہاں انکل یہ دیکھنا ہوگا۔ اب ہوا یہ کہ فلم پڑھنے کے بعد امتحان میں ہر طالب علم کو فلم بنانی پڑتی تھی۔ میں نے بھی بنائی۔ میں نے اپنی ماں پر فلم بنائی۔ "I am proud of my Mom" فلم میں چھلکے سے لے کر آج تک کی اماں کی جدو جہد کو دکھایا۔ کچھ حقیقی کچھ دستاویزی انداز میں جدت کا طریقہ لے کر فلم بنائی جو تجربہ بن گئی۔ یہ فلم یونیورسٹی میں دکھائی گئی۔ وہاں ہالی وڈ کا ایک ڈائریکٹر موجود تھا۔ وہ میرے پاس آیا اور کہا ''اُس کی کمپنی کو جوائن کرو گی؟'' میں پریشان ہوگئی کہ ماں کے دُکھ اب میرے کام آئیں گے۔ دُکھوں سے میں سُکھ لے لوں گی۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اس فلم کو مختلف فلمی میلوں میں کئی ایوارڈ مل گئے اور جب میں ایوارڈ لینے کے لیے سٹیج پر آتی تھی تو رو پڑتی تھی اور کہتی تھی کہ میری مام وہیل چیئر پر بیٹھی ہیں تو لوگ انہیں سٹیج پر بلاتے تھے۔ بس تو پھر میرا رونا نہیں رُکتا

تھا۔ایک دن کیا ہو؟"

"لو جی یہ لڑکی تو مجھ سے بڑی قصہ گو ہے۔" امام بخش نے اعلان کر دیا۔

"اس لیے کہ میرا قصہ بڑا ہے۔" اُس لڑکی نے کہا۔

"تو اب قصے کو بڑھاؤ۔"

"اب ایک دن یہ ہوا کہ میں نے ہالی وڈ کی کمپنی جو کہ بہت مشہور تھی میں کام شروع کر دیا اور ایک بڑی فلم کے سکرپٹ پر کام کر رہی تھی۔ فلم کا سکرپٹ مکمل ہو کر شوٹ پر چلا گیا۔ڈائریکٹر نے مجھے بلایا اور کہا" کیا تم پاکستان سے ہو۔"

"اب پتہ نہیں میں کہاں سے ہوں۔ ہاں ماں پاکستان سے ہے۔ میرا رشتہ پاکستان سے بنا نہیں تھا کہ میں یہاں آ گئی۔"

"اسی لیے تم میں کچھ عجیب ہے۔ کچھ حیرت ہے۔ کچھ تکلیف ہے۔ کچھ چبھن ہے۔کچھ درد ہے۔"

"ہاں یہ کہہ سکتے ہیں۔اب ہالی وڈ اِس سے کیا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔"

"آپ نے جو سکرپٹ لکھی ہے، وہ ہمیں ایک نہیں دو تین آسکر دلوا سکتی ہے۔"

"اب انکل میں نے تو فلم لکھ دی ہے۔ انہوں نے بنالی ہے۔ اماں آخری سانسوں پر تھی کہ مجھے حکم دیا جاؤ اور انکل کو میری کہانی کا انجام بتا دو۔"

"کیا اب وہ نہیں رہیں۔" یہ امام بخش تھا۔

"نہیں وہ وہیل چیئر پر ہیں اور میرا انتظار کر رہی ہیں۔"

"شکر ہے وہ زندہ ہیں۔ میں بھی بس اس کہانی کے لیے زندہ ہوں۔"

"لیکن انکل ایک دن کیا ہوا؟"

"لو جی پھر کہانی پلٹا کھا گئی۔"

"جی انکل یہ ہوا کہ ایک ایمبولینس ہمارے گھر کے سامنے آ کر رُکی۔ دستک ہوئی

اور میں گئی تو مجھے بتایا گیا کہ میرے باپ کا مُردہ جسم یہاں لایا گیا ہے۔ میں نے کہا۔ کون میرا باپ؟ تو بتایا گیا کہ اُس نے آپ کی ماں سے شادی کی تھی اور یہی پتہ ہمارے پاس درج ہے۔ اماں وہیل چیئر پر آئیں اور وہ اُس ایمبولینس تک گئیں۔ انہوں نے چہرے سے کپڑا اہٹایا اور بتایا کہ یہ آپ کے شوہر کی لاش ہے۔ اسے آپ قبول کریں۔''

''اماں نے دیکھا۔ اُس کا چہرہ بدل چکا تھا۔ اُس کا خون اور پانی خرچ ہو چکا تھا۔ بس وہ چمڑے میں موجود تھا۔ اماں نے کہا۔ میں اسے نہیں پہچانتی۔ اسے مسلمانوں کی مسجد میں لے جائیں وہ اس کی تدفین کریں گے۔''

''اب وہ جو میری اماں کو امریکہ میں لایا تھا۔ اُس نے اپنی پہلی بیوی بچوں کو چھوڑا تھا اور پھر اماں سے بھی نباہ نہ کیا تو مجھے اُس پر ترس آ گیا۔ میں آگے بڑھی اور میں نے اُس کے ایمبولینس کے تابوت پر اپنے پرس میں جتنے ڈالر تھے رکھ دیئے۔ گاڑی چلی گئی اور میں کھڑی رہ گئی۔''

یہ کہہ کر وہ لڑکی وہاں سے چلی گئی۔ امام بخش کو محسوس ہوا کہ اُس نے کچھ زیادہ اُس سے کہانی کی تفتیش کر دی ہے۔ اب امام بخش تو کھاٹ پر تھا اور دن ابھی باقی تھا۔ کسی اور کو بھی آنا تھا۔ یہ امام بخش نہیں جانتا تھا۔ پھر سہ پہر کے آس پاس ایک نوجوان کہ عقل شکل سے اجنبی لگتا تھا۔ کسی سے پوچھتا ہوا آ نکلا۔ یہ زوال کا وقت تھا جب امام بخش کی کھاٹ کو اُدھر سے اُٹھا کر اوپر اُس کی کتابوں والی جگہ پر رکھ دیا جاتا تھا۔ مگر جب نوجوان نے آواز دی کہ ''کوئی ہے۔''

تو امام بخش چونکا کہ ''کوئی تو ہے۔''

یہ اب کوئی شام کے آس پاس کا وقت تھا کہ امام بخش بولا ''جو ہے اُسے آنے دو۔''

اب ایک نوجوان کہ جدید لباس میں تھا۔ معلوم نہیں۔ کہاں سے آیا تھا اور وہ بھی

پوچھتا پچھاتا امام بخش کے سامنے آ گیا۔

"امام بخش صاحب سے ملنا ہے کیا وہ زندہ ہیں؟"

"یہ تو معلوم نہیں مگر تم امام بخش کے سامنے کھڑے ہو۔"

اس پر اُس نوجوان نے سُکھ کا سانس لیا کہ پورے دن کی کھوج کے بعد وہ اس گلی کے ایک گھر کے سامنے کھڑا تھا۔

"اجنبی ہو؟ پہلے کبھی اس شہر میں آئے ہو؟"

"نہیں شہر تو مجھے زبانی یاد ہے۔ گلیاں، کوچے، راہداریاں، راستے مگر اُترا پہلی بار ہوں۔"

"کس کی تلاش میں ہو۔"

"ماں کا بچپن اور جوانی تلاش کر رہا ہوں۔"

"مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ کیا پوچھنا ہے۔"

"ماں نے مرتے وقت کہا تھا۔ اُس کے متعلق جو پوچھنا ہے۔ امام بخش سے پوچھو۔"

"تمہاری ماں کون تھی اور کیسے مرگئی اور کہاں؟"

"آپ کو نام بتانا ضروری نہیں ہے۔ ایسی عورتوں کے نام نہیں ہوتے۔ اور کئی نام بدل کر وہ زندہ رہنے کی اداکاری کرتی ہیں۔ تھی وہ بھی کہانیوں میں سے ایک کہانی۔ بس یوں آپ جان لیں گے کہ نواب صاحب کی نکاحی رکھیل تھی۔ مگر....."

"اب جان چکا ہوں۔ مگر نواب صاحب سے تو ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ تم کہاں سے ہو۔"

"میں کسی کا بیٹا نہیں ہوں۔ ماں نے اپنا نام دیا تھا۔"

"تو پھر تم ہی سناؤ۔ ماں نے آخری دَم کہاں دیا۔"

''ہوا یہ تھا کہ ماں نے آخری الفاظ میں کہا تھا کہ یہ جس شہر میں آپ ہیں۔اس میں وفانہیں ہے۔''

اب تو امام بخش کا ماتھا ٹھنکا کہ اُس نے ایک زندگی کے دو جنم ایسے شہر میں گزار دیئے جس میں وفانہیں ہے اور یہ اُس عورت کے الفاظ تھے جو مرتے ہوئے اپنی زندگی کا رَس بیٹے کے حوالے کرگئی۔اب جب امام بخش نے سوچا تو یہ سچ اُسے اپنی زندگی کی دانش میں ایک کانٹے کی طرح چبھا۔اُس نے پھر غور کیا کہ کب کب اُس کے ساتھ بے وفائی ہوئی۔تو پھر امام بخش کے سامنے بے وفائی کے کئی واقعات سامنے آ گئے۔اسی شہر میں کتنے چائے خانے تھے۔کتنی بیٹھکیں تھیں۔کتنے آستانے تھے۔کتنے تھڑے تھے۔کتنے پارک تھے۔کتنے ریستوران تھے۔کتنے عزاخانے تھے۔کتنے صحبت خانے تھے کیا ہوئے؟ کیا یہ بے وفائی نہیں تھی۔ایک ایسی عورت سچ بول گئی جس کے پاس صرف اُس کی زندگی کا سچ تھا اور وہ امام بخش کو آئینہ دکھا گئی۔ بے وفائی صرف یہ نہیں ہوتی کہ کوئی آپ کو دھوکہ دے جائے۔بے وفائی یہ بھی ہوتی ہے کہ زمانہ آنکھیں پھیر لے۔شہر کا شہر بیگانہ ہو جائے۔اب تو لوگ بیگانگی کو بھی زندگی کا حصہ سمجھ لیتے ہیں لیکن بے وفائی یہ بھی ہوتی ہے کہ شہر ہی تبدیل ہو جائے۔امام بخش نے اسے بے وفائی سمجھا کہ اُس کا شہر اب اُس کا نہیں رہا تھا۔مگر مسئلہ یہ تھا کہ اُسے یہ بات کسی باہر سے آئے ہوئے مسافر نے بتائی تھی تو وہ اُداس ہو گیا کہ اب اُس کا کوچ نقارہ بج چکا ہے۔وہ اُس کھاٹ پر بس آخری نگاہ دیکھنے لگا کہ اُس نوجوان نے پوچھا۔

''تو میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔''

''ہاں بولو کیا کہنا ہے۔''

''امام بخش صاحب میں اپنی ماں کے کہنے پر آیا ہوں۔''

''معلوم ہے۔بولو۔''

''وہ بس یہ کہہ کر چلی گئیں کہ امام بخش کو بتا دینا اُس کی کہانی کا انجام کیا تھا۔''

''ہاں کیا تھا انجام؟''

''وہ ایسے تھا کہ میری ماں کو حمل ٹھہر گیا تھا۔ یہ اُسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس کا تھا۔ بہت لوگ اوپر نیچے ہو گئے تھے۔ لیکن ماں نے مجھے بتایا کہ تم کسی کے نہیں ہو۔ اور میں ایک بے نام باپ کے ساتھ جوان ہو گیا۔ پھر جب میں نے ہوش سنبھالا تو میں لندن میں تھا۔ وہ ایسے کہ ماں کو کسی نے تھیٹر میں یہ کہہ کر کوٹھے سے اُٹھا لیا کہ وہ فلموں میں ہیروئن بن جائے گی۔ وہاں سے روزانہ شو کے بعد شہر میں پھلنے پھولنے والے تجارت پیشہ جن میں اکثر پراپرٹی ڈیلر، ٹھیکیدار، مختلف قسم کے دکاندار ہوتے تھے۔ ماں کو اپنی تماش بینی کی آڑ میں لے جاتے تھے۔ اب ایسے میں ایک دن لندن سے چوہدری رفیق آیا۔ ساؤتھ ہال میں اُس کی تندوری بہت مشہور تھی۔ کباب، کڑاہی، تکہ، ٹکا ٹک لاہوری طرز کا بیچتا تھا۔ گورے بھی وہاں کے گاہک بن گئے تھے۔ جن بہت سے پاکستانیوں اور میرپوریوں نے پاکستانی کوزین کو بٹہ لگایا تھا اور اپنے ریستورانوں کے نام انڈین فوڈ کے کھاتے میں ڈال دیئے تھے اور اکثر نے لکھ کر لگا رکھا تھا۔ یہ انڈین ریستوران ہے۔ چوہدری رفیق ایسے پاکستانیوں کو غدار کہہ کر اپنی الگ پہچان رکھتا تھا اور شام پڑتے ہی کڑھائی کا کُرتہ، شلوار اور کُھسّہ پہن کر ریستوران کے باہر ٹہلتا رہتا تھا۔ اُس کے منہ میں کبھی کبھی پان بھی ہوتا تھا۔ وہ کہتا تھا یہ مولا بخش کا پان ہے جو وہ لاہور سے لے کر آیا ہے۔ اس کا دلّی لکھنؤ سے تعلق نہیں ہے۔ کبھی کبھی جوش میں آ کر بوسکی کی قمیص اور ریشمی لنگی اور سلیم شاہی پہن کر بڑھکیں بھی لگا لیتا تھا۔ اُس کے ریستوران کے سب لڑکے بھی پنجاب کا لباس پہن کر کام کرتے تھے۔ چودہ اگست کو جلوس بھی نکالتا تھا اور ریستوران کے ریٹ کم کر دیتا تھا۔''

امام بخش سُن رہا تھا۔ مگر کہیں اور بھی گھوم پھر کے آ جاتا تھا۔ وہ اس نوجوان کی ماں کو اپنی یادداشت میں دریافت کرنے کا جتن کر رہا تھا کہ اُس نے کوٹھے چکلے اور اُن کی

کہانیاں تو محفوظ کی ہوئی تھیں۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ کس کی کہانی ہے۔ سب کی کہانیاں ملتی جلتی تھیں۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ دنیا کی ہر رنڈی، ہر طوائف، ہر رکھیل، ہر نکاحی ڈیرے دارنی اور ہر کال گرل یا ٹیکسی بنیادی طور پر "امراؤ جان ادا" ہے۔ گویا عورت ترقی کر کے فلموں کی کامیاب ہیروئن بن جائے یا ٹی وی کی کامیاب آرٹسٹ کہلائے یا پھر ماڈلنگ کی دنیا کی مدھوبالا بن جائے۔ رات کو وہ کسی نہ کسی کے بستر کی راحت ہی بنے گی اور اُس کا مقدر "امراؤ جان ادا" ہی ٹھہرے گا۔ باقی باتیں بس ملمع کاری ہے۔ یہ سب امام بخش کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔

"آپ سن تو رہے ہیں۔"

"ہاں میں سن بھی رہا ہوں اور دیکھ بھی رہا ہوں کہ زوال کا وقت ہے۔ کیا ہم باقی قصہ کل نہیں کر سکتے۔"

"نہیں یہاں سے مجھے کل ہی جانا ہے۔ میری فلائٹ ہے اور پھر دو دن بعد میرا کنسرٹ ہے۔ جس کی تمام ٹکٹیں بک ہو چکی ہیں۔ ماں کا قرض اتارنے آیا ہوں۔ اب اگر قرض جلدی اُتر جائے تو اچھا ہے۔"

"ٹھیک ہے اُگل دو جو کہانی تمہارے اندر موجود ہے۔ قصہ گو کبھی کہانی اُگلا نہیں کرتے۔ وہ کہانی کو سینت سینت کر سنبھال سنبھال کر۔ پال پوس کے اپنے وجود کا حصہ بناتے ہیں اور پھر وہ لہک لہک کر کہانی کے ساتھ خود بھی بیان بن جاتے ہیں۔ یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ تو اپنا باقی قصہ اُگل دو۔"

"تو ایسا ہوا کہ جو میری ماں نے بتایا چوہدری رفیق نے اچانک اپنے ریستوران بزنس کو شو بزنس کا تڑکا لگا دیا۔ وہ ایسے کہ وہ انڈین جو وہاں اپنی فلموں یا ڈراموں کے مشہور لوگوں کو بُلا کر شو کرتے تھے اور اپنے گلوکاروں کو بلا کر مہنگے ٹکٹ بیچ کر اپنے اور پاکستانیوں کے لیے تفریح کا بندوبست کرتے تھے۔ اُن کے اس کاروبار کو دیکھ کر چوہدری رفیق کا بھی

دل للچایا۔ آخر لاہوری لباس اور کھسے کی لاج بھی رکھنی تھی۔ سو اُس نے پرموٹر بننے کا فیصلہ کیا۔ مگر بہت بڑے ناموں کے فنکار اُس کی پہنچ سے دور تھے۔ اُس نے پاکستانی تھیٹروں سے پانچ سات ڈانسروں اور چار پانچ مسخروں کو لانے کا بندوبست کر لیا۔ کسی نے میری ماں کا بتایا اُس نے فوراً پاسپورٹ بنوایا۔ میں اُس وقت ماں کی گود میں تھا۔ اس طرح ماں لندن پہنچ گئی۔ وہاں تھیٹر کی جگہ ایک اور تھیٹر شروع ہو گیا۔ ڈانسر لڑکیوں کو لینے شام کو گاڑیوں کی قطاریں لگ جاتی تھیں اور وہ پاؤنڈ کمانے لگ گئیں۔ تماش بین پاکستانیوں کی وہاں کمی نہیں تھی۔ کوئی دکان چلاتا تھا تو کوئی کسی لانڈری میں کام کرتا تھا۔ کسی نے شراب کی دکان ڈال رکھی تھی تو کوئی انڈے ڈبل روٹی بیچتا تھا۔ کوئی گوشت کے کاروبار میں لت پت تھا۔ چوہدری رفیق نے سب کے پاسپورٹ قبضے میں رکھے ہوئے تھے اور جب اُسے اس دوسرے دھندے کی کامیابی کا پتہ چلا تو خود بھی حصہ دار بن گیا۔ ایسے میں وہ اپنی من مانی کر کے بالا بالا سودے کرنے لگا۔ اپنی پاکستانی کمیونٹی میں مقبولیت کا اُسے یہ آسان طریقہ معلوم ہوا۔ ایسے میں میری ماں نے خود کو قیدی محسوس کیا اور ایک دن موقع پا کر مجھے گود میں ڈالے وہاں سے بھاگ گی۔''

''یہ سب کچھ تمہیں ماں نے بتایا ہے یا تم کوئی قصہ گوئی میں مہارت رکھتے ہو۔''

''نہیں۔ سب ماں نے صاف صاف بتایا۔ کچھ نہیں چھپایا۔ ماں نے سیاسی پناہ ایک وکیل کے ذریعے مانگ لی۔ وکیل گورا تھا لیکن ایک پاکستانی مسلمان لڑکی سے شادی کی ہوئی تھی۔ جو اُس کے چیمبر ہی میں کام کرتی تھی۔ ماں اُس لڑکی کے ذریعے سیاسی پناہ لینے میں کامیاب ہو گئی۔ مگر اُسے کئی سال لگ گئے وہاں تک پہنچنے کے لیے۔''

''اب تمہاری ماں کہانی میں اتنی جلدی تو یہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ کہانی آسان نہیں ہوتی۔ کہانی جس پر گزرتی ہے اُسے بہت کشٹ کاٹنے پڑتے ہیں۔''

''تو میری ماں نے وہ سب کشٹ کاٹے۔ یہی تو بتانے آیا ہوں۔''

''تو اب شام بھی گزری جا رہی ہے۔ میرے جانے کا وقت بھی ہو گیا ہے تو جلدی بتاؤ۔ پھر کیا ہوا؟''

''ماں کو ابھی سیاسی پناہ نہیں ملی تھی۔ کوئی طریقہ رہنے سہنے کا نہیں تھا تو ایک دن ایک گوری ماں کو سڑک پر مل گئی۔ گوری ماں کے پاس آ کر بولی۔ تمہیں گھر چاہیے رہنے کے لیے۔ تو ماں اُس کے گھر میں آ گئی۔ ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا چوتھی منزل پر۔ لفٹ نہیں تھی۔ ماں کو سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں مجھے ساتھ لے کر۔ کئی دفعہ مجھے اٹھا کر سیڑھیاں چڑھتی تھیں۔ سردیوں میں اُس میں کوئی گرمائش نہیں تھی۔ وہ گوری سارا دن سوتی تھی۔ رات کو سستے میک اپ میں تیار ہو کر کال گرل کے لباس میں تیار ہو کر ایک کھمبے کے ساتھ کھڑی ہو جاتی تھی۔ لندن میں اس طرح کے کاروبار پر پابندی ہے۔ مگر وہ پولیس سے بچنے کے سارے طریقے جانتی تھی۔ اُس کی مرضی کی گاڑی آ کر رُکتی تھی تو وہ اُس میں بیٹھ جاتی تھی۔ اُس نے ماں کو بھی سب سکھا دیا تھا۔ سارا دن ماں میرے سکول کے باہر بیٹھی رہتی اور مجھے لے کر گھر آتی۔ مجھے کھانا دیتی۔ مجھے ہوم ورک کراتی اور جب وہ سمجھتی کہ میں سونے جا رہا ہوں تو وہ تیار ہوتی۔ سستے میک اپ سے چہرہ لیپ کرتی۔ گوروں کے اُترے لباس کو پہنتی، اونچی ایڑی کی پھٹی ہوئی جوتی پہنتی اور سمجھتی میں سو رہا ہوں۔ میں جاگ رہا ہوتا تھا اور وہ چلی جاتی۔ وہ اُس گوری کے ساتھ کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو جاتی۔''

''تم نے کبھی ماں کو لندن میں کھمبے کے ساتھ کھڑے ہوتے دیکھا تھا۔''

ہاں دیکھا تھا۔ وہ ایسے کہ میں جھوٹ موٹ کی نیند سے اٹھ کر کھڑکی میں آ کر دیکھتا۔ وہ کھمبے سے لگ کر کھڑی ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ پولیس کی گاڑی ہوٹر بجاتی آئی تو ماں ساتھ کی گلی میں چُھپ گئی۔ وہ چلے گئے تو پھر آ کر کھڑی ہو گئی۔''

''کیا تمہاری ماں نے یہ بتایا کہ وہ کہاں جاتی تھی۔''

''اب یہ میں کیوں پوچھتا کہ ماں تو میرے لیے یہ سب کر رہی تھی۔ پھر مجھے

سکول میں میوزک کلب نے ٹیسٹ کر کے داخل کر دیا تو میں نے وہاں انڈین، پاکستانی اور عربی میوزک کا فیوژن بنا دیا۔''

''بچے یہ فیوژن کیا ہوتا ہے؟'' اب امام بخش کی آخری سانسوں کا امتحان تھا۔

''وہ ایسے ہے کہ جیسے شریفوں کی اولادیں تماش بینوں میں شامل ہو جاتی ہیں تو پتہ ہی نہیں چلتا کون شریف ہے کون شریف نہیں ہے۔ بس اسی کو فیوژن کہتے ہیں اور یہ تو اب ہر گھر میں ہو رہا ہے۔''

''اچھا تو اس کا مطلب ہے زمانہ بدل گیا ہے اور میں جس جنم میں ہوں وہ کوئی انسان کا امتحان ہے۔''

''یوں سمجھ لیں۔ مگر میرا میوزک ایسا نہیں ہے۔ میرے اندر کئی طرح کی زبانیں، کئی طرح کے علاقے اور کئی طرح کے موسم آپس میں گُھل مل چکے ہیں۔ مجھے گاتے ہوئے معلوم نہیں ہوتا کہ میں نے کب کس سُر کو پکڑا ہے اور کب کسی اور سُر میں داخل ہو گیا ہوں۔ اسی بات پر لوگ بہت پُرجوش ہو کر میرے کنسرٹ میں ہزاروں کی تعداد میں آتے ہیں۔''

''تم بہت مشہور ہو چکے ہو۔''

''یہاں میں زیادہ نہیں جانتا۔ نہ مجھے معلوم ہے شہرت کیا ہوتی ہے۔ یہاں میں خاموشی سے آیا ہوں بس آپ کو اماں کے متعلق بتا کے جا رہا ہوں اور یہاں کبھی نہیں آؤں گا۔''

''اگر کسی نے تمہارا کنسرٹ کیا تو پھر بھی نہیں آؤ گے۔''

''اس کا مجھے پتہ نہیں ہے۔''

''اس شہر کے ساتھ تمہاری ماں کا گزرا ہوا وقت جُڑا ہوا ہے۔ تو تم نہیں چاہو گے کہ اس شہر میں کچھ وقت گزارو۔''

''امام بخش۔ میری ماں کا جو وقت گزرا وہ آپ بھی جانتے ہو۔کل کے نواب طوائف کو گھر بٹھا لیتے تھے۔آج وہ سب جا چکا ہے۔میری ماں نے دونوں زمانے دیکھے۔ ہر زمانے میں اُسے ماس اُتارنے والے ملے۔مگر اُس نے کبھی گلہ نہیں کیا۔نہ آنسو بہائے۔ نہیں وہ مرضی سے اپنے جسم کو ٹھنڈے گوشت میں بدلتی رہی۔یہ میں کہہ رہا ہوں۔اُس کا بیٹا اور لندن سے صرف امام بخش کو تلاش کر کے یہی بتانے آیا ہوں۔کیا سمجھے امام بخش۔''

اب امام بخش نے دیکھا کہ دن ڈھل چکا ہے۔شام بھی رخصت ہو چکی ہے۔شہر خاموش ہونے والا ہے۔پھر شہر چُپ ہو جائے گا۔اور یہ نو جوان بھی جس جھونکے کے ساتھ آیا ہے۔ چلا جائے گا اور یہ شہر اپنی عورتوں کو برقعوں میں قید کرنے کے باوجود ہر روز ننگا کرے گا۔امام بخش ابھی سوچ رہا تھا۔اور وہ نو جوان کہ لندن میں اتنا مشہور سنگر بن چکا تھا۔ صرف اپنی ماں کا جسم ڈھانپنے یہاں آ گیا تھا۔مگر نہیں جانتا اُس کی ماں جسم سے نکل گئی تھی۔ ہر بندے کو زندہ ہوتے ہوئے بھی کئی بار اپنے جسم سے نکل جانا ہوتا ہے۔وہ نو جوان اب بولنا چاہتا تھا۔امام بخش سونا چاہتا تھا۔کبھی کبھی یہ عجیب حادثہ ہو جاتا ہے۔مگر قصہ گو کو نیند نہیں آنی چاہیے۔اس کا قصہ چلنا چاہیے۔امام بخش کو لگا آخری گھڑی دستک دے رہی ہے مگر اُسے قصہ گو کی حیثیت میں مرنا ہے تو قصہ تو ختم نہیں ہوگا۔ چلتا رہے گا۔اُس نے اُس اجنبی نو جوان سے آخری خطاب کیا۔

''میں امام بخش ہوں اور تمہاری ماں نے اپنی کہانی مجھے سنائی تھی۔مگر وہ کہانی بس اتنی تھی کہ کہانی شروع ہوئی تھی اور ابھی اُسے بہت آگے جانا تھا۔اب تم آ گئے ہو تو اپنی ماں کو مکمل کر جاؤ۔''

''ہاں میں بھی جانا چاہتا ہوں۔اس شہر سے مجھے نہ تو دلچسپی ہے نہ نفرت ہے کہ جسے میں نے دیکھا نہیں۔اُس سے نفرت کیوں کروں گا۔''

''ٹھیک ہے بتاؤ لندن میں تمہاری ماں نے میرے متعلق آخری بات کیا کی تھی

کہ اب میں بھی اُس کا بوجھ سینے سے اتارنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں تو ماں کھمبے سے لگ گئی تھی۔ میں سکول میں میوزک سیکھتا گیا تو وہ کبھی سکول میں آ جاتی۔ مجھے گاتا ہوا دیکھتی تو خوش ہو جاتی تھی۔ اُسے نہیں معلوم تھا۔ میں ایک دن راک سٹار بن جاؤں گا۔ میں بنا نہیں ہوں۔ بن سکتا ہوں کہتے ہیں کہ جس کا باپ نہ ہو۔ اُس میں ایک فالتو رگ ہوتی ہے۔ تو کوئی تو فالتو رگ مجھ میں تھی۔ اور یہ میرا حق تھا۔ یہ حق میں استعمال کرنا چاہتا ہوں۔''

''مجھے نہیں معلوم یہ راک سٹار کیا ہوتا ہے اور تم نے کیا خوشی ماں کو دی۔''

''ہاں ہوا یہ کہ ماں کھمبے سے لگنا چھوڑ گئی تھی اور اُسے سیاسی پناہ مل گئی تھی اور اُس نے گزارہ الاؤنس لینا شروع کر دیا تھا۔ اب کھمبا اُس سے زیادہ لمبا ہو گیا تھا اور میں کھمبے کے قد کے برابر آنے لگا تھا تو ماں نے مجھے گاتے ہوئے کئی جگہوں پر دیکھا تو اُسے نئی زندگی مل گئی۔ بلکہ نئی نہیں اصل زندگی مل گئی۔ ماں زندہ کب تھی۔ ماں تو اب زندہ ہونے لگی تھی۔ ماں نے مجھے بتایا کہ امام بخش اگر چاہے گا تو مجھے عزت مل سکتی ہے کہ وہ صرف مجھے عزت دے سکتا ہے اس لیے میں یہاں آیا ہوں۔ مجھے ماں کی عزت چاہیے۔''

''ہاں ٹھیک جگہ آئے ہو۔ تو بتاؤ ماں کیسے فوت ہو گئی۔''

''اب آپ کو یقین نہیں آئے گا۔''

''تو سنو بیٹے یقین میں آنے والی کوئی بھی بات نہیں ہوتی۔ یقین کرنا پڑتا ہے۔''

''تو پھر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ماں کمزور ہو گئی تھی اور اُدھر یہ جو نیا زمانہ آیا ہے اس میں تو نئی سے نئی ایجاد آ چکی ہے۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ میں سوشل میڈیا پر مقبول ہو گیا۔ مگر آپ کیا جانیں گے سوشل میڈیا کیا ہوتا ہے۔''

''ہاں وقت گزرا جا رہا ہے۔ یہ بتا دو ماں کیسے مر گئی تھی۔ میری سانس اٹکی ہوئی

ہے۔قصہ گو کا قصہ ختم ہونے والا ہے۔"

"وہ ایسے کہ ویمبلے میں جو کہ لندن کا سب سے بڑا ہال ہے جس میں امیتابھ بچن اور شاہ رُخ خان کے شو ہوتے ہیں۔ وہاں میرا شو تھا۔ مطلب کنسرٹ تھا۔ میں وہاں تک کیسے پہنچا۔ اب اِس بات کا ذکر آپ کے لیے بے معنی ہوگا۔ تو یوں سمجھیں کہ ویمبلے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پاکستانی، انڈین، گورے، بنگالی اور ہر طرح کے نوجوان لڑکے لڑکیاں جمع تھے۔ میں ہسپتال سے ماں کو دیکھ کر کنسرٹ کے لیے روانہ ہوا۔ ماں کو پھیپھڑوں کا عارضہ تھا۔ شاید ٹی بی کی آخری سٹیج تھی۔ ماں نے کبھی بتایا نہیں تھا۔ میری شہرت ایسے نکلی کہ نہ وہ سمجھ سکی نہ کچھ اِس زمانے سے اُس کا رشتہ بن سکا۔ جب میرے پاس وہاں کی کرنسی آئی تو ماں کی بیماری ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ میں اُسے ہسپتال چھوڑ کر شو کے لیے سٹیج پر اپنے سازندوں کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ ابھی میں نے دو گانے ہی گائے تھے کہ منتظمین میں سے ایک نے آ کر اعلان کیا کہ ویمبلے ہال کی سیڑھیوں پر ایک بوڑھی عورت گر کر فوت ہو چکی ہے۔ اُس نے ایک ہسپتال کے مریضوں کا لباس پہنا ہوا ہے۔ اگر کوئی شناخت کرنا چاہتا ہے تو باہر آ جائے۔ یہ سُن کر میں چونکا۔ میں سمجھ گیا میری ماں ہسپتال سے چوری چوری بھاگ کر میرا کنسرٹ سننے آئی ہوگی اور اندر تک نہیں آ سکی ہوگی۔ میں نے منتظمین سے کہا کہ مجھے صرف باہر جانا ہے اور پھر میں کنسرٹ مکمل کروں گا۔

"رُک جاؤ نوجوان۔ میں تمہاری ماں کی کہانی سن چکا ہوں۔ مجھے اُس کے انجام سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ اُس کا انجام بہت پہلے میرے سامنے ہوگیا تھا جب اُس نے بتایا تھا کہ کیسے ایک نواب نے اُسے دو کپڑوں میں اپنی انیکسی سے نکالا تھا اور وہ چکلے میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔"

"مگر امام بخش میرے لیے ماں اُس دن نہیں مری تھی۔ اُس دن مری جب میں ویمبلے میں کنسرٹ کر رہا تھا۔ مجھے ماں کو سرخرو کرنا ہے۔ یہ بات آپ تک پہنچانی ہے۔

امانت ہے میرے پاس آپ کو سُننا ہوگی۔''

ہاں سُنادو۔ میں تو ویسے بھی اسی بات کے سُننے کے لیے سانس لے رہا ہوں۔''

''تو پھر میں باہر گیا۔ لوگ جمع تھے۔ کئی طرح کی پولیس گاڑیاں بلبلا رہی تھیں۔''

''تمہاری زبان ماں کی لگتی ہے۔ یہ بلبلانا کیسے استعمال کیا ہے؟''

''ہاں ماں سے سیکھا ہے سب کچھ۔ جب میں دودھ کے لیے روتا تھا یا بھوک سے بے چین ہو جاتا تھا تو وہ بولتی تھی۔ بلبلانا بند کرو۔''

''تو میں نے تمہاری ماں کو پہچان لیا ہے۔ اب تم اپنا قرض اتارو اور چلے جاؤ۔''

''میں نے ماں کو سیڑھیوں پر ہسپتال کے لباس میں گرے ہوئے دیکھا۔ وہ میرا کنسرٹ سننے کے لیے ہسپتال سے بھاگ کے آئی تھی اور پہنچ نہ سکی۔ میں نے ماں کا ٹھنڈا اور خاموش چہرہ دیکھا۔ اس پر چادر ڈالی اور ایمبولینس کو گھر کا پتہ بتایا۔ وہ اُسے اٹھا کر لے گئے۔ میں واپس آیا اور کنسرٹ میں شامل ہوا۔ مجھے سٹیج پر دوبارہ دیکھ کر ہال پھر سے جاگ اُٹھا اور میں نے وہ کنسرٹ مکمل کیا۔ ماں نے آخری بات آپ کے لیے یہ کی تھی ''کبھی کبھی غلط راستہ بھی انسان کو صحیح جگہ پر پہنچا دیتا ہے۔''

یہ جملہ امام بخش نے سُنا۔ اس ایک جملے میں اُس کے دونوں جنم پلک جھپکتے میں گزر گئے۔

اور جب امام بخش نے دیکھا تو وہ جا چکا تھا۔ وہ آیا بھی تھا کہ یہ محض واہمہ تھا اور امام بخش کو جاگتے کا کوئی خواب آیا تھا۔ سامنے گلی خالی تھی۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس کی کھاٹ آہستہ آہستہ زمین سے اُوپر اُٹھ رہی ہے۔ اُسے کوئی اُٹھا کر اوپر اُس کی کتابوں والے کمرے تک لے جا رہا تھا۔ مگر وہاں تو کوئی نہیں تھا۔ کھاٹ خود بخود آہستہ آہستہ اوپر اُٹھتی جا رہی تھی۔ امام بخش سیدھا لیٹا آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا چوبارہ گزر گیا۔ پھر اُس کے آس پاس کے مکان جو چھوٹے بڑے ڈبوں کی شکل کے تھے۔ اوپر نیچے رکھے ہوئے ڈبے۔ کھاٹ ان سے

بلند ہونا شروع ہوگئی۔ گلیاں، سڑکیں، راستے باریک ڈور کی طرح پھیلے ہوئے محسوس ہوئے۔ اب محلّہ نیچے رہ گیا۔ پھر کئی محلے۔ پھر پورا شہر بہت نیچے ایک جزیرے کی طرح نقطہ بن گیا۔ کھاٹ اوپر ہی اوپر بلند ہوتی گئی۔ امام بخش نے آنکھیں بند کرلیں۔ ٹھنڈی ہوا اُسے محسوس ہونے لگی۔ زمین بہت نیچے رہ گئی۔ اُس کی کھاٹ بادلوں سے گزرتی رہی۔ گہرے نیلے آسمان کی چھت صاف دکھائی دے رہی تھی اور پھر وہ کھاٹ اُس نیلے آسمان کی چھت سے ٹکرا گئی۔ امام بخش سوچکا تھا۔

کہتے ہیں پچھلے زمانوں میں کوئی امام بخش تھا۔ اور یہ بھی سنا ہے کہ شاید نہیں تھا۔ ایسا کوئی کردار نہ واقعہ کبھی رونما ہوا۔ شاید ایسا کوئی شہر بھی نہیں تھا۔ لیکن ہو بھی سکتا ہے۔ شہروں کا کیا ہے۔ کندھے سے کندھا ملا کے کھڑے ہوتے ہیں۔ جڑواں لگتے ہیں۔ ایک میں داخل ہو جاؤ تو لگتا ہے وہی ہے جس میں پہلے کبھی داخل ہوئے تھے۔ امام بخش بھی ایک خواب کی طرح آیا اور چلا گیا۔ قصہ گو خود بھی تو ایک قصہ ہوتا ہے۔ جس کا یقین کرنا ہے کرلو۔ نہیں کرنا نہ کرو۔ ایسا ہی کچھ ہوا امام بخش کے ساتھ۔ ایک تھا امام بخش ہمارا تمہارا امام بخش۔ ایک تھا بادشاہ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔

کہانی سے اصغر ندیم سیّد کا رشتہ ٹی وی ڈرامے کے میڈیم کے حوالے سے بہت مقبول اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہے۔ انھوں نے پی ٹی وی، جیو، این ٹی ایم، اے آر وائی اور آج ٹی وی کے لئے پچاس سے زیادہ سیریلز اور سینکڑوں انفرادی کھیل لکھے۔ اس حوالے سے بی بی سی ٹیلی وژن لندن نے ان کے کام پر دستاویزی فلم تیار کی۔ ترکی اور عربی زبانوں میں ان کے کھیل ڈب کر کے دکھائے گئے برطانوی ڈرامہ نگار Roxaney کے ساتھ مل کے تھیٹر لکھا۔

انھوں نے ایک ناولٹ ''آدھے چاند کی رات'' اور افسانوی مجموعہ ''کہانی مجھے ملی'' پیش کیا۔ اب یہ ان کا پہلا ناول ہے۔ اصغر ندیم سیّد پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں ادب، فلم، تھیٹر اور ٹی وی سٹڈیز گذشتہ کئی دہائیوں سے پڑھا رہے ہیں۔

سرورق: قدوس مرزا

Rs. 600.00

www.sangemeel.com
ISBN-10 969-35-3225-2
ISBN-13 978-969-35-3225-8
9 789693 532258